۷۲ دِن
۴ جون ۱۹۴۷ء سے ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء تک

۷۲ دِن

۴ جون ۱۹۴۷ سے ۱۴-۱۴ اگست ۱۹۴۷ تک

احمد شجاع پاشا

سنگِ میل پبلی کیشنز، لاہور

کرنل (ر) ملک محمد ممتاز کے نام

ممی کی دعاؤں کی ہر وقت ضرورت رہتی ہے

954.03 Ahmad Shuja Pasha
72 Din; 4 June, 1947 say 14 August, 1947 tak / Ahmad Shuja Pasha. -Lahore : Sang - e - Meel Publications, 2002.
183p.
Kitabiat; p. 183
1. Tareekh - Pakistan. 2. Tareekh India. I. Title.

2002.

نیاز احمد نے
سنگِ میل پبلی کیشنز لاہور
سے شائع کی۔

ISBN 969-35-0816-5

Sang-e-Meel Publications
25 Shahrah-e-Pakistan (Lower Mall), P.O. Box 997 Lahore-54000 Pakistan
Phones 7220100-7228143 Fax 7245101
http://www.sang-e-meel.com e-mail: smp@sang-e-meel.com
Chowk Urdu Bazar Lahore. Pakistan Phone 7667970

[illegible] پرنٹرز، لاہور

"——— برما کو ہندوستان سے الگ کرنے میں تین سال لگ
گئے سندھ کی بمبئی سے علیحدگی دو سال میں مکمل ہوئی۔
اڑیسہ کو بہار سے الگ کر کے نیا صوبہ تشکیل دینے
میں بھی دو سال لگ گئے۔
مگر ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لئے
صرف اڑھائی مہینے دیئے گئے ———"

ترتیب

4 جون 1947ء

برصغیر کی تقسیم سے متعلق
ماؤنٹ بیٹن کی پریس کانفرنس

خوبرویان جفا پیشہ وفا نیز کنند
بکسان درد فرستد و دوا نیز کنند

دنیا بھر سے تین سو کے قریب صحافی اس ایوان میں موجود تھے۔ چین' روس' یورپ' امریکہ غرضیکہ دنیا کے ہر خطے سے اخباروں کے نمائندے برصغیر کی آزادی کا اعلان سننے اور اس کے مضمرات کو سمجھنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ برطانیہ کے دور اقتدار میں وائسرائے کی طرف سے کی جانے والی یہ دوسری پریس کانفرنس تھی۔ اس سے پہلے ایک کانفرنس ہوئی تھی۔ اور پھر یہ سلسلہ ختم ہو گیا۔ 1858ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے اقتدار کی منتقلی کے بعد انگلستان کے بادشاہ کا نمائندہ جسے وائسرائے کہا جاتا تھا برصغیر کے سیاہ و سفید کا مالک سمجھا جانے لگا تھا۔ اس کی رہائش کے لئے دہلی میں ایک بہت بڑا محل تعمیر کیا گیا تھا۔ جو انگریز کی نظر میں مغل عظمت کو فراموش کر کے انگریزی شوکت کے قیام کے مترادف تھا۔ 37 دیوانخانوں اور تین سو چالیس کمروں پر مشتمل یہ ایوان انگلستان کے بادشاہ کے نمائندے کی رہائش گاہ تھا۔ مغل انداز سے بنائے ہوئے اس کے باغات کی دیکھ بھال کے لئے چار سو اٹھارہ مالی تھے۔ ان میں سے پچاس صرف باغات کو پرندوں کی تباہ کاریوں سے محفوظ رکھنے کے لئے ملازم تھے۔ اصطبل میں سیاہ رنگ کے پانچ سو سے زائد گھوڑے تھے اور ان کے لئے پانچ سو گھڑسوار تھے جن کا تعلق پنجاب سے تھا وائسرائے کے محافظ دستے کی حیثیت سے موجود رہتے تھے۔ شاہانہ کروفر کا یہ مظاہرہ مغلوں کے اقتدار کا عکس تھا۔ انگریز یہ سمجھے ہوئے تھے کہ برصغیر کے لوگوں کو مرعوب کرنے کے لئے اس قسم کا مظاہرہ ازبس ضروری تھا۔ راجوں' مہاراجوں' نوابوں اور بادشاہوں کی حکمرانی نے برصغیر کے لوگوں کے دلوں میں شاہانہ کروفر کا ایک خوف سا پیدا کر دیا تھا۔ اور انہیں اس منظر سے دہل جانے کی عادت سی ہو گئی تھی۔

اس پریس کانفرنس کا تعلق ان اعلانات سے تھا جو اس کے قیام سے ایک دن قبل آل انڈیا ریڈیو سے نشر کئے گئے تھے۔ پہلے ماؤنٹ بیٹن نے برصغیر کی تقسیم اور انڈیا اور

پاکستان کے قیام کا اعلان کیا تھا۔ پہلے ماؤنٹ بیٹن نے تقریر کی تھی۔ اس نے برصغیر کی تقسیم پر عدم اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے برصغیر کے رہنے والوں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ آپ لوگ پچھلے سو سال سے ایک وحدت کی طرح اکٹھے رہ رہے تھے۔ اس نے متحدہ رسل و رسائل 'متحدہ دفاع' ایک کرنسی اور ایک پوسٹل سروس کو جنم دیا تھا۔ مجھے امید تھی کہ آپ کے آپس کے اختلافات اس نظام کو تباہ نہیں کریں گے۔ میں نے برصغیر کے تمام زعماء پر 16 مئی 1946ء کے کیبنٹ مشن کے پلان کو منظور کرنے پر زور دیا۔ میرا خیال ہے کہ یہ پلان تمام فرقوں کے مفادات کی نگہداشت کی ضمانت دیتا ہے۔ مجھے افسوس ہے کہ میرے لئے برصغیر کے زعماء کو کیبنٹ مشن پلان پر متفق کرنا ممکن نہ ہو سکا۔ اور میں ہندوستان کے اتحاد کو برقرار رکھنے میں ناکام رہا۔ مگر بڑے بڑے علاقوں کو جہاں ایک فرقے کی اکثریت ہے دوسرے فرقے کی مرضی کے خلاف اکثریت کی حکومت قبول کرنے پر مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس کی صورت ثانی تقسیم ہے۔ مگر جب مسلم لیگ نے ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کیا تو کانگریس نے انہی دلائل کی بنا پر بعض صوبوں کی تقسیم کی مانگ کی۔ میرا خیال ہے کانگریس کی یہ دلیل ناقابل تردید ہے۔

قائداعظم نے اپنی نشری تقریر میں مسلمانوں کو حکومت کی طرف سے دیئے گئے تقسیم کے پلان پر جذبات سے الگ ہو کر اطمینان سے اور ٹھنڈے دل سے غور کرنے کی تلقین کی۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں اس امر کا احساس ہونا چاہئے کہ ہمیں انتہائی اہم فیصلے کرنے ہیں۔ ہمارے سامنے برصغیر کی سیاست کے گھمبیر مسائل ہیں۔ ان مسائل کے حل سے برصغیر کے چالیس کروڑ عوام کا مستقبل وابستہ ہے۔ دلی مسلم لیگ کے حلقوں کے حوالے سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کا ردعمل پر امید ہے۔ مگر اس پلان کے متعلق حتمی فیصلے سے پہلے اس کے تمام پہلوؤں کا بنظر غائر مطالعہ ضروری ہے۔ پلان کے پیراگراف گیارہ کی رو سے صوبہ سرحد میں موجودہ قانون ساز اسمبلی کے ووٹوں کے ذریعہ استصواب رائے ہو گا۔ استصواب صوبائی حکومت سے مشورے کے بعد گورنر جنرل کی زیر نگرانی ہو گا۔ صوبہ سرحد کے عوام کو اس استصواب کے ذریعہ یہ فیصلہ کرنا ہو گا کہ پاکستان اور ہندوستان کی آئین ساز اسمبلیوں میں سے کس کا ساتھ دینا چاہتے ہیں ——

قائداعظم نے اپنی تقریر میں ان تمام لوگوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا جنہوں نے

پاکستان کے کاز کے لئے قربانیاں دیں اور جائیداد کا نقصان برداشت کیا اور امید ظاہر کی کہ سرحد کے عوام کا فیصلہ عادلانہ۔ منصفانہ اور آزاد ہو گا ——

پنڈت نہرو نے اپنی تقریر میں ہندوستان کے مستقبل سے متعلق وقوع پذیر ہونے والی تبدیلی کا ذکر کیا اور کہا کہ ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کوئی بیرونی طاقت نہیں کر سکتی۔ اس کا حق صرف ہندوستان کے عوام کے پاس ہے اور پھر انہوں نے ان تجاویز کی طرف سامعین کی توجہ دلائی جو ان کے کہنے کے مطابق کانگریس کو بادل ناخواستہ قبول کرنی پڑی تھیں۔ انہوں نے کہا کہ مجھے ان تجاویز کو قبول کرنے کا اعلان کرتے ہوئے کوئی مسرت محسوس نہیں ہوتی۔ ہم ایک مدت تک متحدہ ہندوستان کی آزادی کے لئے جدوجہد کرتے رہے ہیں۔ ہمارے لئے چند علاقوں کو ان کی خواہشات کے متعلق علیحدگی اختیار کرنے کی اجازت دینا تکلیف دہ ضرور ہے مگر مجھے یقین ہے کہ ہمارا یہ فیصلہ درست ہے۔ وہ متحدہ ہندوستان جس کے لئے ہم نے جدوجہد کی جبر اور مجبوری سے متعلق نہیں تھا۔ بلکہ وہ موافقت اور معاشرت کی ایسی تنظیم تھی جو موافقت اور معاشرت سے رہنے والوں کی تخلیق تھی۔ ممکن ہے اس صورت میں ہم ایک متحدہ ہندوستان حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ ہندوستان میں برپا ہونے والے اس انقلاب کے پیش نظر ہمیں ایک نئے عمل کا آغاز کرنا ہے۔

قائداعظم کی نشری تقریر سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ مسلم لیگ تین جون کا پلان قبول کر لے گی۔ پنڈت نہرو کی باتوں سے یہ اشارے مل رہے تھے کہ گو کانگریس نے پاکستان کے قیام کو ناگزیر سمجھ کے قبول کیا ہے مگر امید یہ تھی کہ پاکستان پھر ہندوستان کے ساتھ الحاق کرے گا اور یوں ہندوستان ایک بار پھر متحد ہو جائے گا۔

چار جون 1947ء کی پریس کانفرنس انہی امور سے متعلق تھی۔ ماؤنٹ بیٹن سے سوال تو بہت کئے گئے۔ ان سوالوں کے جوابات میں سے خصوصی توجہ کے مستحق کچھ ایسے مسائل تھے جن کا حل بظاہر بہت مشکل معلوم ہوتا تھا۔ انگریزوں نے سکھوں کے مسئلے کو اچانک اس قدر اہم بنا دیا تھا کہ اسے سلجھانا آسان کام نہیں تھا۔ کانگریس اپنے مفاد کو مدنظر رکھتے ہوئے اس کو مزید پیچیدہ بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ دوسری بات ریاستوں اور راجوں مہاراجوں کے اقتدار اعلیٰ کی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کا کہنا تھا کہ انگریز کے اقتدار

اعلیٰ کے تمام ہو جانے کے بعد ریاستیں خود مختار متصور ہوں گی۔ انہیں یہ اختیار حاصل ہو گا کہ وہ جس آئین ساز اسمبلی سے چاہیں الحاق کر لیں۔ بصورت دیگر انہیں دوسرے ایسے انتظامات کرنے کا حق حاصل ہو گا جنہیں وہ اپنے لئے مناسب سمجھتے ہیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے راجوں مہاراجوں کو آزادی کی روشنی تو دکھا دی تھی مگر انہیں یہ نہیں بتایا کہ وہ اس روشنی کے حصول کے لئے کیا اقدام اٹھائیں۔ اگر آزادی کا اعلان کر دیں تو اس پر قائم کیونکر رہیں اور اگر کوئی ایسی قوت جو ان سے بہتر ہو جس کے پاس مسلح فوج ہو اگر انہیں اس ڈگر سے ہٹانے کی کوشش کرے تو وہ کس کو مدد کے لئے پکاریں۔ انگریز نے ریاستوں کو دو چار دس سپاہیوں پر مشتمل فوج رکھنے کی اجازت تو دے رکھی تھی مگر اس سے کسی خاص کام کی توقع کبھی نہیں کی تھی۔

ماؤنٹ بیٹن نے ایک سوال کے جواب میں ضلع گورداسپور کا حوالہ دیتے ہوئے یہ کہا تھا کہ کوئی علاقہ کسی خاص فریق کو اسی وقت ودیعت کیا جا سکتا ہے جب اس علاقے میں اس فریق کی غالب اکثریت ہو' اس نے گورداسپور میں مسلمان اکثریت سے متعلق غلط اعداد و شمار پیش کئے تھے اور یہ بتانے سے گریز کیا تھا کہ تقسیم کے لئے صرف آبادی ہی کا اصول نہیں اپنایا گیا۔ دوسرے حقائق سے استفادہ کرنے کی اجازت بھی دے دی گئی ہے (اس امر کا فیصلہ باؤنڈری کمیشن کے قیام پر ریفرنس کی شرائط کا تعین کرتے ہوئے کیا گیا تھا۔ یہ فیصلہ چونکہ تین جون کے اعلان کے بعد ہوا اس لئے ماؤنٹ بیٹن کے لئے گورداسپور کا حوالہ دینا محض قبل از وقت ہی نہیں تھا۔ ایک خاص مقصد کی نشاندہی کرتا تھا)

سب سے اہم اعلان جو ماؤنٹ بیٹن نے اس پریس کانفرنس میں کیا وہ انتقال اقتدار کی حتمی تاریخ کا اعلان تھا۔ برطانوی حکومت نے اقتدار برصغیر کے قائدین کو جون اڑتالیس سے پہلے منتقل کرنے کا عندیہ دیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس کے لئے پندرہ اگست 1947ء کی تاریخ کا اعلان کر کے ایسے لوگوں کو جو پس پردہ ہونے والے فیصلوں سے ناآشنا تھے ورطہ حیرت میں ڈال دیا۔ قائداعظم اور مسلم لیگ نے اس عجلت پر اعتراض بھی کیا اور تاریخ کو کچھ آگے بڑھانے کی درخواست کی۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس مطالبے کو درخور اعتنا نہیں سمجھا اور اسے مسترد کر دیا ——— اس سے پوچھا گیا ——— کہ آپ کے

ارشاد کے مطابق تمام فریق انتقال اقتدار میں عجلت سے کام لینے پر متفق ہیں تو کیا آپ کے ذہن میں اس سلسلے میں کوئی تاریخ ہے ———"

"ہاں ——— ہے ———" ماؤنٹ بیٹن نے جواب دیا

"کیا اس تاریخ کے متعلق ہمیں کچھ بتایا جائے گا ———"

فریڈم ایٹ مڈ نائٹ کے مصنفین کا کہنا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے انتقال اقتدار کے لئے آخری تاریخ منتخب نہیں کی تھی۔ اس سوال پر اس کے ذہن کو جھٹکا سا لگا۔ گزرے ہوئے واقعات اس کے دماغ کے پردے پر سرسرانے لگے وہ تاریخ کے متعلق فیصلہ کرنے کی غرض سے اپنے ذہن کے گوشوں کو ٹٹولنے لگا ——— اس نے حتمی تاریخ کا اعلان کرنے سے پہلے بات کو طول دینے کی نیت سے کہا "اس ضمن میں تیز رفتاری معاملات کو سلجھانے کے لئے اہم ہے۔ میں پارلیمنٹ سے ضروری ایکٹ اس کے گرما کی تعطیلات کے لئے منتشر ہو جانے سے قبل تشکیل دلانا چاہتا ہوں۔ ہم آتش فشاں کے دہانے پر بیٹھے ہیں۔ ایک ایسے بم کے پاس جس کا فیوز متحرک ہے۔ ہمیں یہ معلوم نہیں کہ فیوز کب پھٹ جائے۔"

یہی مصنفین کہتے ہیں کہ اس کے سامنے کہوٹا کی ادھ جلی لاشوں اور تباہ شدہ مکانوں کے دلدوز منظر لہرانے لگے (کہوٹا میں مسلمانوں نے سکھوں اور ہندوؤں پر حملہ کر کے بہت سوں کو ہلاک کر دیا تھا۔) مصنفین نے افسانے کو حقیقت سے قریب لانے کے لئے رنگ آمیزی کی ہے اور پڑھنے والوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے جیسے اپنی ذہنی کیفیت کے متعلق ماؤنٹ بیٹن نے انہیں خود آگاہ کیا ہو۔ یورپ خاص طور پر انگلستان میں ماؤنٹ بیٹن کو ہیرو تسلیم کرنے کے بعد اسے ہیرو کے انداز میں پیش کرنے والے صحافیوں اور ادیبوں کی خاصی تعداد موجود ہے۔ ایسے بھی ہیں جو اس کی خامیوں کو بھی خوبیوں کا رنگ دے کر پیش کرتے ہیں۔ بہت سی نمایاں کمیوں کو پیش کرنے کا انداز کچھ ایسا ہوتا ہے کہ اس کمی میں وہ تندی نہیں رہتی۔ اور پڑھنے والا اسے بھول سمجھ کر نظر انداز کر جاتا ہے۔

کہتے ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن نے اس سوال پر اپنے ذہن میں کچھ اندازے لگائے۔ سوچا کہ انتقال اقتدار کے لئے کون سی تاریخ موزوں ہو گی۔ کون سی تاریخ کا اعلان کیا

جائے۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولے۔

"میں نے انتقال اقتدار کے لئے ایک تاریخ منتخب کر رکھی ہے۔"

وہ مختلف تاریخوں کے متعلق سوچتے رہے۔ اور پھر ان کے ذہن نے ایک جھٹکا سا کھایا۔ انہیں ایک ایسی تاریخ کا خیال آ گیا۔ اس تاریخ کا تعلق ان کی زندگی کی سب سے اہم ظفر مندی سے تھا۔ یہ وہ تاریخ تھی جب جاپانیوں نے شکست تسلیم کر لینے کے بعد ہتھیار ڈال دیئے تھے۔ وہ جذبات سے مغلوب ہو گئے۔ ان کی آواز بھرا گئی۔ وہ بولے

"اقتدار پندرہ اگست کو ہندوستان کے حوالے کر دیا جائے گا" یہ ماؤنٹ بیٹن کا فیصلہ تھا۔ انہوں نے اس ضمن میں کسی سے مشورہ نہیں کیا تھا۔ کسی سے پیشگی اجازت طلب نہیں کی تھی۔ خود فیصلہ کیا تھا اور خود ہی اس کا اعلان کر دیا تھا۔ فریڈم ایٹ مڈ نائٹ کے مصنفین کا کہنا ہے کہ ان کے اس اعلان سے برطانوی دارالعوام، شاہی محل اور وزیراعظم کی رہائش غرضیکہ وہ ایوان جن کا اقتدار سے تعلق تھا لرز سے گئے۔ مصنفین کے مشاہدے کے مطابق اقتدار کے ایوان اس فیصلے سے ضرور لرز گئے ہوں گے۔ مگر تاریخ کہتی ہے کہ اس فیصلے پر نہ تو کسی نے برہمی کا اظہار کیا۔ نہ ماؤنٹ بیٹن کو سرزنش کی گئی۔ نہ ہی ان سے اس کی وجہ پوچھی گئی۔ برطانیہ اور ہندوستانی کانگریس کے زعما کی طرف سے کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا گیا۔ اگر ماؤنٹ بیٹن کے پاس ہندوستان کے مستقبل سے متعلق تمام کے تمام اختیارات تھے اور ان اختیارات کے جائز اور ناجائز استعمال سے متعلق ان سے پوچھ کچھ نہیں ہو سکتی تھی پھر بھی یہ فیصلہ کچھ ایسا تھا جس کے لئے برطانوی حکومت کی پیشگی رضامندی اس لئے ضروری تھی کہ پارلیمنٹ کو اس ضمن میں قانون سازی کرنی تھی اور قانون سازی کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد پندرہ اگست سے پہلے ہندوستان کی آزادی کا قانون بنا کر ماؤنٹ بیٹن کے حوالے کرنا تھا۔ برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی۔ مہاتما گاندھی۔ جواہر لال نہرو اور مسلم لیگی قائدین کو چھوڑ کے ہندوستان کی دیگر مقتدر شخصیات نے اس اعلان پر کسی ردعمل کا اظہار نہیں کیا۔ اسے ہدف تنقید نہیں بنایا گیا حالانکہ کانگریس کی رضامندی حاصل کئے بغیر کئے جانے والے اعلانات عام طور پر مسترد کر دیئے جاتے تھے۔ اس لئے نہیں کہ ان میں خامیاں ہوتی تھیں اور کانگریس اصلاح کی غرض سے انہیں مسترد کرتی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ

کانگریس سے مشورہ کئے بغیر ہندوستان کے مستقبل کے متعلق کوئی اعلان نہ تو جائز سمجھا جا سکتا تھا اور نہ اسے کانگریس کی قبولیت کا شرف حاصل ہوتا تھا۔ اس اعلان پر برطانوی حکومت کی طرح کانگریس نے بھی مکمل خاموشی اختیار کئے رکھی۔ کسی حلقے کی طرف سے کسی قسم کے ردعمل کا اظہار نہیں کیا گیا۔ یہ خاموشی۔ یہ سکوت معنی خیز تھا۔ اگر دکھاوے ہی کے لئے معمولی سا احتجاج کر دیا جاتا تو کسی قسم کے شبے کی گنجائش نہ تھی۔ مگر فریب ہی کے لئے بھی احتجاج نہیں کیا گیا۔ اس قسم کی خاموشی اختیار کی گئی جس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ ماؤنٹ بیٹن کو اس اعلان کے لئے ان تمام حلقوں کی تحریک حاصل ہے جو اس پر تنقید کر سکتے تھے۔ اور تحریک کے حصول کے لئے معاملات عام طور پر ایسے اعلان سے قبل گفت و شنید کے ذریعہ طے کئے جاتے ہیں۔ اس قدر اہم تاریخ کے تعین کے سلسلے میں ماؤنٹ بیٹن کا ذاتی فیصلہ عجیب بھی ہے اور حیران کن بھی۔ یہ ایک ایسا فیصلہ تھا جس سے برصغیر اور برطانیہ دونوں کا مستقبل وابستہ تھا اور قومیں اور آزاد ممالک اس قسم کے فیصلے بے سوچے سمجھے نہیں کیا کرتے۔

دوسری جنگ عظیم کے بعد برطانیہ اقتصادی لحاظ سے مفلوج ہو چکا تھا۔ اس کے پاس مزاحمت کی سکت بھی باقی نہیں رہی تھی۔ وہ اندر سے کھوکھلا ہو چکا تھا۔ برصغیر میں مزید قیام اس کے لئے ممکن نہ رہا تھا۔ اس نے خود نکل جانے کو نکالے جانے پر ترجیح دیتے ہوئے برصغیر سے دستبردار ہو جانے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اگر جنگ کے بعد ہونے والے انتخابات کا چرچل کے حق میں فیصلہ ہو جاتا تو برصغیر میں انتقال اقتدار میں ممکن ہے تاخیر ہو جاتی۔ چرچل کا مزاج خسروانہ تھا اور سامراجیت کا اس کے ذہن پر مکمل قبضہ تھا۔ اس نے جنگ کے دوران برطانیہ کی قیادت سنبھالی تھی اور برطانیہ کو فتح سے ہمکنار کرنے والا بھی وہی تھا۔ مگر برطانوی عوام نے جنگ جیتنے کے بعد اس کی قیادت کو قبول کرنے سے انکار کر دیا اور الیکشنوں میں چرچل کی کنزرویٹو جماعت کی بجائے ایٹلی کی لیبر پارٹی نے کامیابی حاصل کی۔

ایٹلی کلیمنٹ نے جب برطانیہ کے وزیراعظم کے عہدے کا حلف اٹھایا تو لارڈ ویول برصغیر کے وائسرائے تھے۔ چرچل سیاسی کی حیثیت سے ویول کی کارکردگی سے مطمئن نہیں تھے۔ اطلانتک کے اس پار سے امریکی قیادت بھی ان سے ناخوش تھی۔ ویول کو

کمان سے الگ کرنے کے منصوبے زیر غور تھے۔ برطانوی حکومت یہ تاثر نہیں دینا چاہتی تھی کہ برطانوی سپاہ کے کمانڈر کو نااہلی کی بنا پر برطرف کیا جا رہا ہے۔ اس لئے لارڈ ویول کے لئے کوئی ایسی نئی جگہ تلاش کی جا رہی تھی جہاں انہیں بغیر کسی تذبذب کے کھپایا جا سکے۔ چرچل انہیں آسٹریلیا کا گورنر جنرل بنا کر آسٹریلیا میں "دفن" کر دینے کے متعلق بھی سوچ رہے تھے۔ کہ اتفاق سے برصغیر کے وائسرائے کا منصب خالی ہو گیا۔ اس منصب پر لارڈ لنلتھ گاؤ فائز تھے۔ انہیں 1936ء میں وائسرائے بنا کر دہلی بھیجا گیا تھا۔ ان کی ریٹائرمنٹ پر اس اہم عہدے کے لئے کسی مناسب شخصیت کی تلاش ہو رہی تھی۔ چرچل کی کابینہ کے وزیر خارجہ انتھونی ایڈن کا نام بھی اس ضمن میں زیر غور تھا اس عہدے میں اپنی ایک کشش تھی۔ اسے قبول کرنے سے انکار ہر کسی کے بس کی بات نہیں تھی۔ اس عہدے کے ساتھ ایک خاص قسم کی سطوت اور جلالت منسلک تھی۔ اس عہدے کا ایک رعب تھا۔ ایک دبدبہ تھا اور اس کی بزرگی میں وہ سب کچھ تھا جس کا حصول انسانی ترقی کی معراج سمجھی جاتی تھی۔ ایڈن کو یہ خیال ضرور تھا کہ چرچل کے بعد ایک نہ ایک دن وہ برطانیہ کے وزیراعظم ہوں گے۔ اگر وہ وائسرائے بن کر برطانیہ سے نکل گئے اور برطانوی سیاست سے علیحدہ ہو گئے تو برطانیہ کا وزیراعظم بننے کے امکانات ان کے لئے معدوم ہو جائیں گے۔ انہوں نے یہ عہدہ قبول کرنے سے گریز کیا۔ ویول کی فوج سے علیحدگی فوج کی مستقبل کی مہمات کے لئے ضروری سمجھی جا رہی تھی۔ یہ محض اتفاق ہے کہ اس عہدے کے لئے ویول کو منتخب کر لیا گیا۔ وہ خود کہتے ہیں کہ وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے اجلاسوں میں شرکت کے بعد اور وہاں ہونے والی بحث سننے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ اس قسم کے کام کے لئے نہ تو ان کے پاس صلاحیت تھی اور نہ ایسا کوئی ارادہ۔ انہیں تو یہ خیال تھا کہ انہیں جنوب مشرقی ایشیا میں اتحادی افواج کا کمانڈر مقرر کر دیا جائے گا۔ جب انہیں وائسرائے کا عہدہ پیش کیا گیا تو انہوں نے یہ سوچا کہ ان کی خدمات کے بہتر استعمال کے لئے انہیں سپریم کمانڈر کی بجائے وائسرائے بنایا جا رہا ہے۔ انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ چرچل نے انہیں طاقچے میں سجا کر رکھ دینے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ انسان اپنی صلاحیتوں کے متعلق بہت کچھ سوچتا ہے مگر اسے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ دوسرے انہی صلاحیتوں سے جن پر اسے اس قدر اعتماد ہوتا ہے

بیزار ہیں۔ ویول نے برصغیر کے سیاسی مسائل کے حل کے متعلق بہت کچھ سوچا تھا۔ اسے یقین سا تھا کہ اگر اسے اپنے طریق سے ان مسائل کو حل کرنے کی اجازت دے دی جائے تو اسے ناکامی نہیں ہو گی۔ مگر برطانوی قیادت سے تبادلہ خیال کے بعد اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ برطانیہ برصغیر کے قائدین سے انہیں ٹالنے کی حد تک گفت و شنید کا قائل ہے۔ برصغیر کی آزادی کے لئے کوئی ٹھوس قدم اٹھانے کو تیار نہیں۔ انہوں نے اپنی ڈائری میں لکھا تھا۔ اور یہ تحریر ان کی برصغیر روانگی سے قبل چرچل سے ملاقات کے بعد کی ہے۔ یہ ملاقات آٹھ اکتوبر کو ہوئی تھی۔ ویول نے لکھا تھا۔ مجھے یہ استدراک ہو گیا ہے کہ (برطانوی) کابینہ اپنے اعلانات کے مطابق ہندوستان میں تشیت کے معاملے میں راست باز اور مدین نہیں اور ان میں سے بہت کم ایسے ہیں جن کے پاس بصیرت اور سیاسی جرات ہے۔ چرچل پر قیصریت پسندی سے احتراز کے لئے امریکی دباؤ بھی تھا۔ اور امریکہ کا صدر برصغیر کی آزادی کے لئے بھی کوشاں تھا مگر چرچل کسی صورت سامراجیت سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس کے پیشرو بھی اس سے متفق تھے اور لنلتھ گاؤ نے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے ویول سے کہا تھا کہ ہندوستان کی سیاسی حیثیت کا مسئلہ ہندوستانیوں کی حماقت اور انگریزوں کی بددیانتی سے وابستہ ہے اور ہم دیر تک اس ڈگر پر نہیں چل سکیں گے۔

ویول کو ہندوستان آنے سے پہلے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ ہندوستان کے بعض علاقوں میں غذائی اجناس کی قلت ہے اور بنگال میں قحط سے حالات خراب ہو چکے ہیں۔ اس نے اجناس کے ذخیرے میں اضافے کے لئے درخواست ضرور کی تھی مگر اس درخواست کو درخور اعتنا نہیں سمجھا گیا تھا۔ ہندوستان پہنچنے پر اسے لنلتھ گاؤ نے بتایا کہ حالات ابتر ہیں اور قحط سے دس سے پندرہ لاکھ بنگالیوں کے ہلاک ہو جانے کے واضح امکانات ہیں۔ جاپانی ایشیا کے ان علاقوں پر قابض ہو چکے تھے چاول کی پیداوار کے لئے جن کا نام تھا۔ بنگال کے لوگ عام طور پر چاول ہی کھاتے تھے۔ ایک تو جاپانیوں کے ان علاقوں پر قبضے سے بنگال میں چاول کی درآمد بند ہو گئی تھی۔ دوسرے انتظامیہ کی نااہلی نے ذخیرہ اندوزوں کو چاول ذخیرہ کرنے کے مواقع فراہم کر دیئے تھے۔ ویول معجزے تو کر نہیں سکتے تھے۔ انہوں نے بنگالیوں کے مصائب کو حتی المقدور کم کرنے کی کوشش کی۔

لارڈ المیسری نے ویول کو چرچل کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا تھا کہ ایسے عمل جن کا تعلق ہمارے ایفائے عہد سے ہو اگر کسی صورت رک جائیں تو مناسب ہوگا۔ اور انہی احساسات کے پیش نظر ہر موڑ پر ہمارے لئے رکاوٹیں کھڑی کر دی گئی ہیں چرچل تو مہاتما گاندھی کو ننگا فقیر کے نام سے پکارتا تھا۔ اور گاندھی اور دوسرے ہندوستانیوں سے اس کی نفرت میں نسل پرستی کا عنصر بھی تھا۔ اسے یہ برا معلوم ہوتا تھا کہ ایک برہنہ گدا اگر انگریز وائسرائے کے محل میں جاکر انگریز کے برابر کرسی پر جا بیٹھے اور اس سے یوں گفتگو کرے جیسے اس کے برابر کا ہو۔ جب مہاتما گاندھی کو ان کی صحت کی خرابی کی بنا پر قید سے رہا کر دیا گیا تو ویول نے ان سے برصغیر کی سیاست سے متعلق بات چیت کرنے کی اجازت چاہی تھی۔ سیکریٹری آف سٹیٹ فار انڈیا نے ویول کی درخواست مسترد کر دی اور انہیں مہاتما سے گفتگو کی اجازت نہیں دی گئی۔ ان غیر اہم واقعات سے جنہیں تاریخ ریکارڈ تک نہیں کرتی برصغیر کے متعلق برطانوی قیادت کی نیت ظاہر ہو جاتی ہے۔ انگریز بظاہر تو یہی کہتے چلے آ رہے تھے کہ برصغیر کی آزادی ان کا نصب العین ہے اور وہ وقت آنے پر اسے آزاد کر دیں گے۔ مگر ان کی نیت یہ تھی کہ جب تک ممکن ہو سکے ہندوستان کو زنجیروں میں جکڑے رکھو۔ ایٹلی کے زمانے میں برصغیر کی آزادی کا اعلان اور انتقال اقتدار کے منصوبے کی تشکیل صحیح اس لئے ہوئی کہ برطانیہ میں ہندوستان کی بیداری کی قوت کو کنٹرول کرنے کی سکت باقی نہ رہی تھی۔ برطانیہ جنگ تو جیت گیا تھا مگر اس کی جیت نے اس کی توانائیاں سلب کر لیں۔ اسے یقین سا ہو گیا کہ دوسری جنگ عظیم میں فتح حاصل کر لینے کے بعد اس میں اپنی ہندوستانی رعایا کی ممکنہ بغاوت فرو کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہی۔ اٹھارہ سو ستاون کی شورش کی بات کچھ اور تھی اس وقت مسلمانوں کی حکومت زوال سے ہمکنار تھی۔ اندرونی خلفشار نے اسے اس قدر کمزور کر دیا تھا کہ وہ اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کی اہل ہی نہ رہی تھی۔ اس بغاوت میں ہندوؤں نے بھی مسلمانوں کا ساتھ دیا۔ بغاوت کا منصوبہ تو تھا مگر اس منصوبے پر عملدرآمد کے لئے قیادت مفقود تھی۔ اور جنگ آزمائی کرنے والی مختلف ٹکڑیوں میں ہم ربطی بھی نہیں تھی۔ اگر بغاوت کے منصوبے کی تکمیل کے لئے قائد موجود ہوتے اور شورش بے ترتیبی سے نہ پھیلتی تو میرٹھ سے سپاہی قائد کی تلاش میں دہلی نہ پہنچتے اور ہندوستان کے آخری تاجدار سے قیادت

سنبھالنے کی درخواست نہ کرتے۔

ویول نے اپنی ڈائری میں یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ چرچل کو ہندوستانی فوج کی نفری میں اضافہ پر شدید اعتراض تھا۔ اور اس نے اس کے لئے ویول پر الزام دھرتے ہوئے ہندوستان کی فوج کو فرینکنسٹائن سے تعبیر کیا تھا۔ (فرینکنسٹائن مسز شیلے کے ایک ناول کا مرکزی کردار ہے جس میں ہیئت تبدیل کر کے ذی روح کو انسانی شکل دینے کی صلاحیت ہے اور جو اس صلاحیت کے استعمال سے صلاحیت ودیعت کرنے والے کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے) چرچل کو یہ خیال تھا کہ یہ ہندوستانی فوج جسے انگریز نے اپنے مقصد کے لئے تربیت دی ہے کہیں اپنے ہی خالق کو ہڑپ نہ کر لے۔ چرچل سامراج پسند تھا۔ وہ فرنگی قیصریت کا پرستار تھا اور اس کی پسپائی کے لئے کسی صورت تیار نہ تھا۔ سامراجیت کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ تجارت اور اس کے لئے توسیع پسندی اس کے غالب عنصر رہے ہیں۔ اور پھر سامراجیوں نے مذہب سے بھی اعانت حاصل کی ہے۔ اٹھارھویں اور انیسویں صدی میں یورپ کے مختلف ممالک میں صنعتوں کے قیام نے یورپ کے رہنے والوں کو اپنے ہاں بننے والے مال کے لئے خریدار پیدا کرنے کی غرض سے اور اس مال کی تخلیق کے لئے سستے خام مال کے حصول کے لئے سامراجیت کی ترغیب دی۔ یوں برطانوی۔ فرانسیسی' جرمن اور ولندیز سلطنتوں کا قیام عمل میں آیا۔ ان ممالک کے لوگ تاجروں کی حیثیت سے گھروں سے نکلے اور دور دراز کے ممالک کے حاکم بن بیٹھے۔ برصغیر کا معاملہ اس ضمن میں بڑی واضح مثال ہے سترھویں اور اٹھارھویں صدی میں برصغیر انگریز کی تجارت کے مسئلے کے لئے بحرانی کیفیت کا حامل ملک بن گیا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی ایک پرائیویٹ ادارے کی حیثیت سے منافع کمانے کی غرض سے قائم کی گئی تھی۔ اور تجارت کے فروغ کے ساتھ برطانوی انتظامیہ نے فوجی چھاؤنیاں قائم کر دیں۔ اور تجارتی لحاظ سے اہم قصبوں اور شہروں پر برطانوی قوانین کا اطلاق ہونے لگا۔ کمپنی کے ملازمین جنہیں اپنے سیکولر ہم وطنوں کی مکمل حمایت اور تحفظ حاصل تھا برصغیر کے شہری مراکز میں پھیل گئے جہاں انہوں نے لوگوں کو مغربی ثقافت کی برتری کی طرف متوجہ کر کے انہیں مرعوب کرنے کی کوشش کی اور اپنے ساتھ آنے والے مذہبی کارندوں کے ذریعہ لوگوں کو مذہب تبدیل کرنے کی بھی ترغیب دی۔ برصغیر میں مذہب کی تبدیلی کی

کوشش عام طور پر کامیاب نہیں ہوئی — مگر افریقہ کے مظاہر پرستوں میں ان کے مذہب کی تبدیلی سے حاصل ہونے والی کامیابی نے عیسائیت کے پیروکاروں کی فہرست میں معتدبہ اضافہ کیا۔ وہاں اسلام سے محاذ آرائی بھی ہوئی۔ اسلام چونکہ ان دنوں انحطاط کا شکار تھا اور صلح جوئی کی روح کھو چکا تھا اس لئے یورپ کی یلغار کا مقابلہ نہ کر سکا۔ فرار ہونے یا پیچھے ہٹنے کی نوبت تو نہیں آئی مگر وہ صرف ان علاقوں میں محبوس ہو کے رہ گیا جو افریقہ میں یورپ کے ورود سے پہلے اس کے قبضہ میں تھے۔

——— ویول کو وہ موقع تو نہیں ملا جو دوسرے گورنر جنرلوں کو دیا گیا تھا۔ گورنر جنرل عام طور پر پانچ سال کے لئے بھیجا جاتا تھا۔ بہت سے ایسے بھی تھے جن کی ملازمت کی مدت پانچ سال سے زیادہ رہی ہے۔ مگر ویول کو اپنی میعاد ملازمت مکمل کرنے کی اجازت نہیں دی گئی ——— ویول کی تعیناتی تو چرچل کے زمانے میں ہوئی تھی۔ مگر جنگ میں جرمنوں پر فتح حاصل کر لینے کے بعد چرچل کی سیاسی جماعت کو انتخابات میں عوام نے مسترد کر دیا تھا اور اس کے سیاسی حریف اٹیلی نے جو لیبر پارٹی کا سربراہ تھا حکومت تشکیل دی تھی۔

سدھیر گھوش کی تصنیف "ایمری آؤ گاندھی" میں یہ انکشاف کیا گیا ہے کہ نہرو اور گاندھی نے ویول کی شکایت کی تھی۔ گاندھی نے تو اس کے متعلق یہ کہا تھا کہ برصغیر کے حالات پر اس کی گرفت بہت ڈھیلی ہے۔ بالفاظ دیگر اسے نااہل قرار دینے میں تامل سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ نہرو نے بھی اسی سدھیر گھوش کے ذریعہ برطانوی کابینہ کے پاس ویول کے خلاف الزامات کی فہرست بھجوائی تھی۔ یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ سدھیر گھوش کانگرسی زعماء اور برطانوی لیبر کابینہ کے درمیان خفیہ پیغام رسانی پر مامور تھا۔ وہ گاندھی اور نہرو کے پیغامات لندن پہنچاتا تھا اور لندن سے وصول ہونے والی ہدایات اور معلومات نہرو اور گاندھی تک پہنچاتا تھا۔ اس خفیہ رشتے سے انکار ممکن نہیں۔ سدھیر گھوش کی کتاب کو شائع ہوئے ایک مدت ہو چکی۔ اس کے انکشافات کی تردید نہ تو دہلی سے کی گئی نہ لندن سے ہوئی۔ برصغیر کی تقسیم سے متعلق دستاویزات جو برطانیہ کے پاس تھیں اور جو بوجوہ خفیہ رکھی گئی تھیں اب آہستہ آہستہ ڈی کلا سیفائی کی جا رہی ہیں۔ کچھ راز جو ابھی تک طشت ازبام نہیں ہوئے وہ آہستہ آہستہ منظر عام پر آ جائیں گے۔

سوال یہ ہے کہ برصغیر کی کانگرسی قیادت اور برطانوی قیادت میں یہ ہم آہنگی کیوں کر پیدا ہوئی۔ عام تجزیہ نگاروں کا خیال ہے کہ یہ ہم آہنگی نظریاتی تھی۔ پنڈت جواہر لال نہرو بزعم خود سوشلسٹ تھے۔ انہیں بائیں بازو سے تعلق پر فخر تھا۔

برطانیہ کی لیبر پارٹی کی وابستگی بھی بائیں بازو کی سیاست سے تھی۔ صرف نظریاتی ہم آہنگی کی بنا پر اس قسم کے تعلقات کچھ عجیب سے معلوم ہوتے ہیں۔ بات کچھ اور تھی جو ابھی تک نظر تو نہیں آئی مگر تاریخ کے راز چھپے نہیں رہتے۔ ماؤنٹ بیٹن نے جو سازش کی وہ اس کی رحلت کے کچھ ہی دیر بعد فسانہ بن کر لوگوں کی زبان پر آ گئی۔ اس میں کلام نہیں کہ برطانیہ کی لیبر کابینہ کے اراکین خاص طور پر سٹیفورڈ کرپس کی کانگرسی قائدین سے دوستی تھی۔ ہندوستان میں ان کا قیام کانگرسی لیڈروں کے گھروں ہی میں ہوتا تھا۔ کرپس نے خود بھی اس امر کا اعتراف کرتے ہوئے کہا تھا۔ (اور یہ اعتراف 23 مارچ 1942ء کو منعقد ہونے والی پریس کانفرنس میں کیا گیا) کہ ماضی میں میں اپنے کانگرسی دوستوں کے دوسرے فرقوں اور دوسری سیاسی جماعتوں کی بہ نسبت زیادہ قریب تھا۔ کانگریس کے ایک قائد جن کا نام گپتا تھا سے سٹیفورڈ کرپس کے گہرے مراسم تھے۔ اس کی برصغیر آمد پر قائداعظم نے بھی خدشات کا اظہار کیا تھا اور کہا تھا کہ وہ کانگریس کا دوست ہے اور آنند بھون (آنند بھون الہ آباد میں پنڈت نہرو کی رہائش گاہ کا نام تھا) میں پنڈت نہرو کی مہمان نوازی سے لطف اندوز ہو چکا ہے۔ اور بہت سے بھی کرپس کے رجحانات اور میلان طبع سے آگاہ تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ مسلمان کرپس پر اعتماد نہیں کر سکتے کیونکہ وہ کانگریس نواز ہے اور اسے مسلم لیگ سے عداوت ہے۔ اس نے کانگرسی نقطہ نظر اپنا رکھا تھا اور پاکستان کے مطالبے کا تمسخر اڑاتے ہوئے کہا تھا کہ پچیس کروڑ ہندوؤں کی خود مختاری کے لئے آٹھ کروڑ مسلمانوں کی ناقابل عمل تجاویز کو زیر غور لانا مناسب نہیں۔

یہ صرف کرپس کی کانگریس نوازی ہی نہیں جو برطانوی کابینہ کو کانگریس کے اس قدر قریب لے آئی تھی کابینہ اور کانگرسی زعماء کے درمیان خفیہ پیغامات کا تبادلہ معمول کی بات بن گئی تھی۔ اتنے گہرے تعلقات کے لئے کچھ اور وجوہ بھی ہوں گی۔ ان خفیہ روابط کی ویول نے بھی تصدیق کر دی تھی۔ اس نے وزیراعظم اٹیلی سے کہا تھا "میں ہندوستان کے حالات کی ذمہ داری قبول کرنے کے لئے تیار نہیں ہو سکتا جبکہ آپ کی

کابینہ کے بعض ارکان کے ایک ایجنٹ کے ذریعہ کانگریس سے روابط ہیں اور یہ کام مری پیٹھ پیچھے ہو رہا ہے۔ لارڈ ویول نے کانگریسی لیڈر سردار پٹیل اور سدھیر گھوش کے درمیان ٹیلیفون پر ہونے والی خفیہ گفتگو کا ریکارڈ بھی بھجوایا —— سدھیر گھوش لندن میں اپنے تعلقات سے فائدہ اٹھاتا رہا۔ اس نے سٹیفورڈ کرپس کو ایک چٹھی لکھی اور کہا کہ وائسرائے کے رویئے سے انگریزوں اور ہندوستانیوں کے مستقبل کے تعلقات پر گہرے اثرات مرتب ہو سکتے ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ کرپس نے سدھیر گھوش کو مرہون منت کرنے کی غرض سے کابینہ کے دوسرے اراکین کی اعانت بھی حاصل کی۔ وزیر خارجہ ارنسٹ بیون نے بھی جن کا اس معاملے سے براہ راست کوئی تعلق نہ تھا وزیراعظم کے پاس ویول کی برطرفی کی سفارش کی اور الزام یہ لگایا کہ وائسرائے کا رویہ شکست آمادگی کا مظہر ہے۔

معلوم یوں ہوتا ہے کہ ویول کو الگ کر کے ماؤنٹ بیٹن کو وائسرائے بنانے کا اہتمام کیا جا رہا تھا۔ ویول کی راست بازی اور خوش معاملگی کانگریس کو ناپسند تھی اور برطانوی کابینہ کو کانگریس نواز ہوتے ہوئے یہ محسوس کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا کہ ویول کا جھکاؤ مسلم لیگ کی طرف ہے لیبر حکومت کی کانگریس نوازی کا شہرہ عام تھا اور برطانیہ کے لوگ بھی یہ محسوس کر رہے تھے کہ کنزرویٹو حکومت کی حکمت عملی یک طرفہ نہ تھی اور وہ اس قدر ہندو نواز نہ تھی جس قدر لیبر حکومت تھی۔ حقیقت یہ ہے کہ سید احمد خاں کی نصیحت پر برصغیر کے مسلمانوں نے ایثار، ریت اور بے غرضی کا نظریہ اپنا لیا تھا۔ وہ سیاست سے احتراز کرتے تھے۔ وہ ایک مدت تک اس نصیحت پر عمل پیرا رہے۔ جب انہوں نے یہ محسوس کیا کہ اس بے غرضی سے حریفوں کو بالادستی کے حصول کے مواقع مل رہے ہیں۔ انہیں نقصان پہنچانے کے منصوبوں پر عمل کیا جا رہا ہے اور انہیں سیاسی لحاظ سے مکمل طور پر تباہ کر دینے کے لئے پلان بنائے جا رہے ہیں تو انہوں نے بھی اپنے مفادات کے تحفظ کے لئے آواز بلند کی۔ مسلم لیگ 1906ء میں قائم کی گئی۔ سب سے پہلے آغا خاں کی قیادت میں ایک وفد نے وائسرائے سے ملاقات کے بعد مسلمانوں کے لئے کچھ مراعات حاصل کیں جن میں جداگانہ انتخاب کی مراعات بھی شامل تھی۔ اور پھر قائداعظم کی قیادت میں ابتدائی ناکامیوں کے باوجود اپنے پاور بیس کو اس قدر وسیع کر لیا کہ مسلم

لیگ بھی کانگریس کے ہم پلہ سمجھی جانے لگی اور اسے نظر انداز کر کے ملک کے مستقبل کا فیصلہ ناممکن سا نظر آنے لگا۔ ویول کو اس حقیقت کا احساس ہو چکا تھا اور اس کا دونوں سیاسی جماعتوں سے ایک سا سلوک کانگریس نوازوں کو اس لئے پسند نہیں آیا کیونکہ وہ برصغیر کی کسی دوسری جماعت کو —— خاص کر ایک ایسی جماعت کو جو مسلم اقلیت کی نمائندہ متصور ہوتی تھی کانگریس کا ہم پلہ سمجھنے کے لئے تیار نہ تھے۔ ویول نے کانگریس کے قائدین کے عزائم سے برطانوی حکومت کو خبردار بھی کر دیا تھا۔ مگر سٹیفورڈ کرپس کے ہوتے ہوئے برطانوی کابینہ کانگریس کی مخالفت سے گریز ہی کرتی رہی۔

ویول ان دنوں لندن میں تھے جب ان کی جگہ ماؤنٹ بیٹن کی تعیناتی پر غور ہو رہا تھا۔ مگر انہیں نہ تو اس ضمن میں کچھ بتایا گیا نہ ان سے کوئی مشورہ کیا گیا۔ انہیں اپنی ملازمت کی میعاد پوری کرنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔

اکتیس جنوری 1947ء کو انہیں برطانوی وزیراعظم کا لکھا ہوا ایک خط ملا۔ اس میں ویول کے لکھے ہوئے خط کے جواب کا حوالہ دیتے ہوئے کہا گیا کہ حکومت اور وائسرائے کے خیالات کے درمیان برصغیر کے مستقبل کے متعلق تفاوت ہے۔ ویول کو بتایا گیا کہ برطانوی حکومت کو ان کی مستحسن اور واجب الاجر خدمات کا اعتراف ہے اور یہ بھی احساس ہے کہ انہوں نے انتہائی مشکل حالات پر یہ فریضہ ادا کیا۔ اور پھر غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے انہیں کہا گیا کہ وائسرائے کی ملازمت کی میعاد تو پانچ سال ہوتی ہے مگر انہیں تین سال کے لئے اس عہدے پر فائز کیا گیا تھا —— اور وہ مدت ختم ہو چکی۔ ان سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے کہا گیا کہ برصغیر کا وائسرائے بننے سے پہلے وہ میدان جنگ میں فرائض سنبھالے رہے۔ اور انہیں ایک مدت سے جس آرام کی ضرورت تھی وہ نہیں مل سکا۔ ان کی خواہش گھر پر آرام کرنے کی ہو گی۔ مزید براں وائسرائے کا حکومت کی پالیسیوں سے متفق ہونا از بس ضروری ہوتا ہے اور چونکہ آپ کے خیالات اور حکومت کی پالیسیوں میں اختلاف ہے اس لئے برصغیر میں وائسرائے کی تبدیلی ناگزیر ہو گئی ہے۔ آپ نے پالیسی سے اختلاف پر ایک بار ریٹائر ہو جانے کا عندیہ بھی دیا تھا۔ اور حکومت کی رائے یہ ہے کہ ان حالات میں یہی ایک مناسب طرز عمل ہے۔

ویول کا جواب ان کی سلیقہ مندی کا ثبوت تھا۔ انہوں نے یہ ضرور کہا کہ سرسری

انداز سے کی جانے والی یہ برطرفی اس عہدے کے وقار کے منافی ہے جس سے انہیں علیحدہ کیا جا رہا ہے۔ ویول کے سوانح نگار یہ کہتے ہیں کہ ایک ایسا شخص جس نے بڑے پر عزم انداز سے ملک کی خدمت کی ——— حقیر انداز سے برطرف کر دیا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن کے قصیدے لکھنے والے لیری کالنز اور ڈومینیک لاپیئر کا بھی یہ کہنا ہے کہ اٹیلی حکومت کا ویول سے سلوک بہیمانہ تھا۔ جب ماؤنٹ بیٹن کو ان کی جگہ لینے کی دعوت دی گئی تو وہ لندن میں تھے۔ انہیں یہ تک نہیں بتایا گیا کہ ان کی برطرفی کا فیصلہ ہو چکا ہے انہیں یہ اطلاع اٹیلی کے اعلان سے چند ہی گھنٹے پہلے ملی۔ ان واقعات سے تاریخ جن کی شاہد ہے یہ نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ ویول کی برطرفی اور ماؤنٹ بیٹن کی تعیناتی ایک خاص مقصد کو مدنظر رکھتے ہوئے کی گئی تھی۔

——— اور اس کا اولین ثبوت ماؤنٹ بیٹن نے اپنی چار جون کی پریس کانفرنس میں نادانستہ طور پر فراہم کر دیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے انتقال اقتدار کی تاریخ کا اعلان کرتے ہوئے پریس کے نمائندوں کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ یہ تاریخ ان کی اپنی مقرر کردہ اور ان کے پاس اس تاریخ کے تعین کے اختیارات ہیں۔ وہ کمرے میں موجود پریس کے نمائندوں کو اور ان کی فرستادہ خبریں شائع کرنے والے اخبارات پڑھنے والوں کو فریب دینے میں ضرور کامیاب ہو گئے۔ وہ دوسرے دن کے اخبارات کی سرخیوں کے ذریعہ دنیا کو دھوکا دینے میں بھی کامیاب ہوئے مگر وہ تاریخ کو فریب نہ دے سکے۔ 10 اکتوبر 1949ء کو دنیا کو یہ معلوم ہو گیا کہ اس تاریخ کا تعین ایک سازش کے ذریعہ ہوا تھا۔ اور جب ہی لیگی زعماء کی انتقال اقتدار کی تاریخ کو آگے بڑھانے کی درخواست مسترد کرتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن نے کہا تھا ——— 15 اگست انتقال اقتدار کے منصوبے کا انتہائی اہم نکتہ ہے اور اس میں کسی قسم کی تبدیلی کی گنجائش نہیں۔

10 اکتوبر 1949ء کانگریس کے مرد آہن سردار ولبھ بھائی پٹیل نے بھارت کی آئین ساز اسمبلی میں تقریر کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کیا تھا ——— تقسیم اس لئے تسلیم کی گئی کہ اور کوئی چارۂ کار نہ رہا تھا۔ اور دوسری شرائط کے ساتھ یہ شرط بھی رکھی گئی تھی کہ اقتدار دو مہینے کے اندر اندر منتقل کر دیا جائے گا۔ اور اسی مدت کے دوران برطانوی پارلیمنٹ میں ضروری قانون سازی مکمل کر لی جائے گی۔ برطانیہ کی

پارلیمانی تاریخ میں ایسی کوئی مثال نہیں کہ اس قسم کا قانون اتنی قلیل مدت میں منظور کیا گیا ہو۔ مگر یہ سب کچھ ہوا۔

انتقال اقتدار کی تاریخ جون 1948ء کی بجائے 15 اگست 1947ء مقرر کرنے کے متعلق ہندو قائدین کا مطالبہ منظور کر کے ماؤنٹ بیٹن نے جان بوجھ کر لاتعداد مسائل پیدا کر دیئے۔ یہ ایک ایسی سازش تھی جس سے پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا۔ بعض سیاسی مبصرین کا یہ بھی خیال ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے یہ تاریخ تبدیل کر کے اپنی دانست میں اپنے لئے بھارت اور پاکستان دونوں کا مشترکہ گورنر جنرل بننے کی راہ ہموار کرنے کی کوشش کی۔ دو مہینوں میں انتقال اقتدار کی تکمیل کی صورت میں ماؤنٹ بیٹن کی یہ تجویز بظاہر درست معلوم ہوتی ہے۔ تقسیم کے عمل کی دو مہینوں میں تکمیل ناممکن تھی۔ اس کے لئے برطانوی حکومت کی مقرر کردہ تاریخ یکم جون 1948ء ہی مناسب تھی۔ اسے 15 اگست 1947ء قریباً ساڑھے نو مہینے قبل مقرر کر دینا خوفناک نتائج کا حامل عمل تھا۔

بھارت کو چالو مشینری مل رہی تھی۔ اس کے پاس دفاتر تھے۔ دفاتر میں کارندے موجود تھے۔ کارندوں کے پاس کام کاج کی تمام سہولتیں موجود تھیں۔ پاکستان کے پاس کچھ بھی نہیں تھا۔ نہ دفتر نہ فرنیچر نہ کارندے نہ ان کارندوں کے لئے سہولتیں اس کو ہر چیز نئے سرے سے کرنی پڑ رہی تھی۔ نہ خزانہ تھا۔ نہ خزانے میں کوئی پیسہ۔ نہ کرنسی تھی۔ نہ دفاع کا کوئی انتظام۔ یہ نہیں کہ ماؤنٹ بیٹن کو ان مضمرات کا علم نہیں تھا۔ وہ اس قدر نادان تو تھا نہیں کہ ان مسائل سے آشنا نہ ہوتا۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ان مسائل سے لاتعلق تھا۔ اسے یقین تھا کہ پاکستان زندہ رہنے والا نہیں۔ اپنے سیکرٹری ایلن کیمبل جانسن سے پاکستان کے حوالے سے بات کرتے ہوئے ایک پختہ عمارت اور ایک خیمے کا موازنہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ ہم لوگ پاکستان کی صورت میں ایک خیمہ نصب کرنے جا رہے ہیں۔ اگر ماؤنٹ بیٹن نے تاریخ تبدیل کر کے پاکستان کے خلاف سازش کی تو یہ بد سرشتی کی علامت ہے اور اگر یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا کہ اسے دونوں ممالک کا گورنر جنرل تسلیم کر لیا جائے تو یہ بھی خالی ظرفی نہیں۔ کم ظرفی ہے۔ بلکہ یہ کہہ دینا بھی غلط نہ ہو گا کہ اپنا معمولی سا فائدہ اٹھانے کے لئے اپنی انا کی تسکین کے لئے کروڑوں انسانوں کو ناقابل تلافی نقصان پہنچانا ایک ایسی بات ہے جسے رذالت کہہ دینے میں ہچکچاہٹ محسوس

نہیں ہوتی ــــــ

وہ بھی اگست کا مہینہ تھا ــــــ مگر برصغیر میں انتقال منتقل کئے بتیس سال ہو چکے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کی دونوں ممالک کا گورنر جنرل بننے کی خواہش پوری نہ ہو سکی تھی۔ قائداعظم نے اس کی بات ماننے سے انکار کر دیا تھا (کچھ لوگ قائداعظم کے اس فیصلے پر تنقید کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس فیصلے سے پاکستان کو بہت نقصان پہنچا۔ اگر وہ ماؤنٹ بیٹن کی بات مان لیتے تو اس کی انا کی تسکین ہو جاتی اور پاکستان کو وہ نقصان نہ پہنچتا۔ دوسروں کا خیال ہے کہ قائداعظم کا فیصلہ صحیح تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کا ماضی۔ اس کے نہرو سے تعلقات اور اس کی اہلیہ کے نہرو سے تعلقات کھلی کتاب کی طرح قائداعظم کے سامنے تھے۔ وہ پاکستان کا مستقبل کیونکر ایک ایسے شخص کے حوالے کر سکتے تھے جو برصغیر کی تقسیم کا مخالف تھا۔ پاکستان کی تخلیق کے حق میں نہیں تھا۔ جس نے جان بوجھ کر پاکستان سے زندگی کی صلاحیت سلب کرنے کے لئے ایسے اقدامات کئے تھے جن کا علم ہر کس و ناکس کو تھا۔ اگر اسے بھارت کے ساتھ پاکستان کا گورنر جنرل بھی تسلیم کر لیا جاتا تو وہ تقسیم کے تمام اثرات زائل کر کے پاکستان کو اور بھی نقصان پہنچاتا۔ اور پاکستان کو جنم لیتے ہی دفنا دیتا۔ ماؤنٹ بیٹن کی بیوی ایڈوینا نہرو سے جس کے تعلقات کے چرچے زبان زد خاص و عام تھے انتقال کر چکی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن بھی دہلی میں پنڈت ماؤنٹ بیٹن کی جے کے نعرے سننے کے بعد ریٹائر ہو کر واپس انگلستان چلا آیا تھا۔ اگست کے مہینے میں اس کے خاندان کے تمام افراد آئرلینڈ میں واقع اس کے قلعے میں جو ایڈوینا کی ملکیت تھا اور اس کی موت کے بعد اس کے خاندان کے پاس تھا تعطیلات منانے کی غرض سے اکٹھے ہو جایا کرتے تھے۔ اور اس سال بھی 1979ء میں خاندان کے بہت سے افراد وہاں مقیم تھے۔

چار جون 1947ء کو ماؤنٹ بیٹن کی دروغ گوئی اور فریب دہی کا علم مغربی میڈیا کے ذریعہ مغرب تک پہنچ گیا ہو گا۔ مگر اس ضمن میں ماؤنٹ بیٹن پر تنقید کی کوئی مثال سامنے نہیں آئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مغربی میڈیا نے سردار ولبھ بھائی پٹیل کی تقریر "ارادۃً" دبا دی ہو اور ماؤنٹ بیٹن کی اس سازش کا لوگوں کو علم نہ ہونے دیا ہو۔ یا تو یہ کہ مغرب کو اخلاقی اقدار اس قدر عزیز نہیں تھیں کہ ماؤنٹ بیٹن کی اس حرکت کو قابل مواخذہ سمجھا جاتا۔ یا یہ کہ پٹیل کی تقریر کا مطلب نہیں سمجھا گیا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ پٹیل کی تقریر

اشاعت کے قابل ہی نہ سمجھی گئی ہو۔ اسے جان بوجھ کر نظر انداز کر دیا گیا ہو۔ میں ان دنوں سرکاری ملازم تھا اور میرا اندازہ ہے کہ مجھے بھی اس تقریر اور اس واقعے کا اس وقت علم نہ ہو سکا۔ یہ بات وثوق سے نہیں کہہ سکتا۔ حافظے پر زور دے کر سوچتا ہوں تو یاد پڑتا ہے کہ میں بھی اس وقت پاکستان میں ہوتے ہوئے ان حالات سے آگاہ نہ تھا۔ اور اگر تھا تو غالباً اپنی ہی محفل میں احتجاج کرنے کے علاوہ اور کچھ کرنے کا اہل نہ تھا۔

ماؤنٹ بیٹن معمولی شخصیت کا مالک نہیں تھا۔ اس کا تعلق جرمنی کے بیٹن برگ خاندان سے تھا۔ اس کی انگلستان کے شاہی خاندان کے علاوہ جرمنی کے قیصر ولیم ثانی کا عزیز تھا۔ روس کے زار نکولس ثانی۔ ہسپانیہ کے الفانسو دہم۔ رومانیہ کے فرڈی نند اول۔ سویڈن کے گستاو ششم۔ ناروے کے پاکون ہفتم اور یونان کے کانسٹنٹین اول اور یوگو سلاویہ کے الیگزنڈر اول یعنی یورپ کے آٹھ شاہی خاندانوں سے قرابت داری تھی۔ یورپ کے کسی ملک کا کوئی بحران ماؤنٹ بیٹن کے خاندان کا بحران تھا۔ ماؤنٹ بیٹن جب اٹھارہ سال کا ہوا تو انگلستان کے شاہی خاندان کے علاوہ یورپ کے دیگر شاہی خاندان ایک ایک کر کے تاریخ کے صفحوں کی زینت بنتے چلے گئے۔

اس کا والد برطانیہ کا فرسٹ سی لارڈ تھا۔ برطانوی بحریہ اس کے ماتحت تھی۔ اسے جرمن نژاد ہونے کی وجہ سے پہلی جنگ عظیم کے آغاز پر اپنے عہدے سے اس لئے مستعفی ہونا پڑا کہ انگلستان کے عوام کو اس کی وفاداریوں پر اعتماد نہ تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ اس کی وفاداری شک و شبہ سے بالاتر تھی۔ مگر اس کے استعفے کے بعد خاندان کو خاندانی نام بھی تبدیل کرنا پڑا۔ 1917ء میں پہلی جنگ عظیم کے حالات برطانیہ کے حق میں نہیں تھے۔ انگریزی افواج مختلف محاذوں پر پسپا ہو رہی تھیں۔ جرمنی زیپلن ہوائی جہاز کے ذریعہ تباہی مچا رہا تھا۔ فتح کے امکانات کم ہوتے جا رہے تھے۔ ان حالات میں عوام نے الزام دہی کے لئے اپنے بادشاہ کو منتخب کیا۔ جارج پنجم کی رگوں میں جرمن خون موجزن تھا۔ اس کا دادا خالص جرمن تھا۔ اس کے عزیزوں کا تعلق بھی جرمنی سے تھا۔ بیٹن برگ خاندان انگلستان کے شاہی خاندان کا قریبی عزیز تھا اور بیٹن برگ ہوتے ہوئے اس خاندان کے افراد بھی جرمن تھے۔ جارج پنجم پر الزام لگایا گیا کہ وہ ایک غیر ملکی فرمانروا اور اس کے خاندان کی مدد کر رہا ہے۔ جارج پنجم کو غصہ تو بہت آیا مگر خاموشی کے علاوہ

چارۂ کار کوئی نہ تھا۔ اس نے عوام کے شبہات ختم کرنے کے لئے اپنے خاندان کو ونڈسر سے متعلق کر دیا اور بیٹن برگ اس کی ہدایت پر ماؤنٹ بیٹن بنا دیئے گئے۔ بادشاہ کے اس اقدام کو اس کی وطن سے محبت کی دلیل قرار دیتے ہوئے الزام دینے والے تمام کے تمام خاموش ہو گئے۔ بیٹن برگ خاندان کے علاوہ شاہی خاندان کے تمام جرمن نژاد عزیزوں کے خاندانوں کے نام تبدیل کرائے گئے۔ ناموں کی تبدیلی سے جرمنی سے تعلق منقطع ہو گیا اور انگلستان سے محبت کا تصدیق نامہ مل گیا۔

27 اگست 1979ء کو خاندان کے بیشتر افراد ماؤنٹ بیٹن کی "شیڈو وی" نامی کشتی میں لا بسٹر (فارسی میں اسے بچ پالک بھی کہا جاتا ہے) کے شکار کو نکلے۔ ساڑھے گیارہ بجے کے قریب کشتی سمندر میں اتار دی گئی۔ ماؤنٹ بیٹن کے مسلح محافظ سمندر کے کنارے کنارے اس وقت تک کشتی کے ساتھ ساتھ چلتے رہے جب تک ان کی کار کو کنارے پر دوڑنے کا راستہ ملتا رہا۔ کار میں سوار محافظ دور بینوں سے کشتی اور اس میں سوار لوگوں کو دیکھتے رہے۔ ابھی کشتی کو سفر پر روانہ ہوئے صرف پندرہ منٹ ہی ہوئے تھے اور وہ سمندر کے کنارے سے کوئی میل بھر کا فاصلہ طے کر پائی ہو گی۔ کشتی میں زور کا دھماکہ ہوا اور کشتی کے پرخچے اڑ گئے۔ آئرش ری پبلکن آرمی کے جیالوں نے جو سمندر کے کنارے چھپے ہوئے دور بینوں سے کشتی کو آگے بڑھتے ہوئے دیکھ رہے تھے اور جنہوں نے کشتی میں اس کی روانگی سے قبل خطرناک قسم کا کان کنی کے لئے استعمال ہونے والا بارود چھپا کے رکھ دیا تھا ریموٹ کنٹرول کے ذریعہ اڑا دیا۔

دھماکہ اس قدر شدید تھا کہ کشتی ریزہ ریزہ ہو گئی۔ ماؤنٹ بیٹن اور اس کے ساتھ آنے والے بہت سے لوگ مارے گئے۔ چند ایک اس سانحے کی تفصیل بتانے کے لئے زندہ رہ گئے۔ ماؤنٹ بیٹن کی لاش کی شناخت مشکل تھی۔ اسے اس جرسی سے پہچانا گیا جس پر اس کے اس جہاز کا نشان تھا جو دوسری جنگ عظیم میں اس کے زیر کمان تھا۔ اس کا تابوت بڑے تزک و احتشام سے قبرستان تک پہنچایا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی زندگی ہی میں اپنے جنازے کے راستے کا تعین کر لیا تھا۔ اس نے ان لوگوں کی فہرست بھی تیار کر کے لواحقین کو دے رکھی تھی جن کو جنازے میں شرکت کی دعوت دینا تھی۔ اس نے ایک ایک لمحے کی تفصیل مرتب کی تھی۔ خود ان راستوں سے ہو کر جن سے تابوت کو

لے جانے کی ہدایت کی گئی تھی وقت کا تعین بھی کیا تھا' اس نے لائف گارڈز کے موسیقی کے منتظم کو ساز پر اس آہنگ کی ہدایت بھی کر رکھی تھی جو اس کے تابوت کے ساتھ لوگوں کو سنائی جانے والی تھی۔ اس کے پرائیویٹ سیکرٹری کے پاس اس کی اپنی دی ہوئی ان ہدایات کی تفصیل تھی جن کا تعلق اس کے جنازے سے تھا۔

اسے رخصت ہونے والے ہیرو کا احترام دیا گیا۔ جنازے کے جلوس نے ایک میل کا فاصلہ ایک گھنٹے میں طے کیا۔ پچاس ہزار کے لگ بھگ انگریز راستے کے دونوں طرف اسے خراج تحسین پیش کرنے کے لئے کھڑے تھے۔ بحریہ کے ایک سو اکتیس جاشو یا ملاح اس توپ گاڑی کو کھینچ رہے تھے جس پر ماؤنٹ بیٹن کا تابوت رکھا ہوا تھا۔ اور اسے انیس توپوں کی سلامی بھی دی گئی۔

ماؤنٹ بیٹن کی موت پر بھارت میں بھی غم کا اظہار کیا گیا۔ وہ ان کا محسن تھا۔ مگر پاکستان کے عوام میں اس کی موت پر اظہار افسوس کرنے والا کوئی نہ تھا۔ انگلستان کا یہ ہیرو پاکستانیوں کی رائے میں پاکستان کی تخلیق سے متعلق تمثیل کا ولن، تھا۔

ماؤنٹ بیٹن کو برطانوی حکومت کی طرف سے جو تولیت نامہ دیا گیا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ وہ برصغیر کو ہر صورت میں متحد رکھنے کی کوشش کرے گا۔ اس کا اپنا خیال اور نظریہ بھی یہی تھا کہ متحدہ ہندوستان منقسم ہندوستان سے بدرجہا بہتر ہے۔ اس نے اعتراف کیا تھا کہ برصغیر کے حالات کا جائزہ لینے کے بعد وہ اس نتیجے پر پہنچا ہے کہ ہندوؤں' مسلمانوں کے درمیان خیر خواہی اور نیک نیتی کا معقول جذبہ ہندوستان کے اتحاد کو قائم رکھ سکتا ہے جو اس کی نظر میں اس کے تمام مسائل کا بہترین حل ہے۔

ماؤنٹ بیٹن کے رجحانات قائداعظم کے لئے پریشانی کا باعث ضرور تھے۔ وہ قائد سے ہر ملاقات میں انہیں ہندوستان کے اتحاد ہی کے حق میں دلائل پیش کرتا رہا۔ قائد کی ثابت قدمی نے اسے اور برطانوی حکومت کو بادل ناخواستہ برصغیر کی تقسیم پر مجبور کر دیا۔ اس نے قائداعظم کو سخت سست کہنے سے اجتناب نہیں کیا۔ ان کے متعلق یہ کہہ دیا کہ وہ دماغی مریض ہیں۔ جو صرف پاکستان ہی کے آرزو مند ہیں۔

جب اسے یہ یقین ہو گیا کہ قائداعظم متحدہ ہندوستان کے حق میں اس کے دلائل سے قائل نہیں ہوں گے اور اس کا دباؤ قبول کرنے کے لئے تیار نہیں تو اس نے برطانوی

حکومت کی رضامندی سے تقسیم کا اصول تو تسلیم کر لیا۔ مگر اس تقسیم کو پاکستان کے لئے اس خیال سے اس قدر مشکل بنا دیا گیا کہ قائداعظم اس قسم کا پاکستان منظور کرنے کے لئے تیار نہیں ہوں گے اور مجبور ہو کے ہندوستان کے اتحاد کو تسلیم کر لیں گے —— جب بات بنتی نظر نہ آئی تو پاکستان کی تخلیق کے خلاف سازش کی گئی۔ اس کے زیر تسلط علاقے کو اس قدر مختصر کر دینے کا فیصلہ کر دیا گیا تاکہ اسے اقتصادی بدحالی سے مجبور ہو کر پھر سے اتحاد کی درخواست کرنی پڑے اور اس قسم کی درخواست نہ کرے تو اپنے پاؤں پہ کھڑا ہوتا تو کیا اس کا وجود خطرے میں پڑ جائے۔

چار جون کی پریس کانفرنس میں انتقال اقتدار کی تاریخ کا اعلان اسی سازش کی ایک کڑی تھی۔ ایک امریکی مصنف نے پاکستان کے قیام کے لئے مخصوص کی جانے والی مدت پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا۔

"برما کو ہندوستان سے الگ کرنے میں تین سال لگ گئے۔ سندھ کی بمبئی سے علیحدگی دو سال میں مکمل ہوئی' اڑیسہ کو بہار سے جدا کر کے نیا صوبہ تشکیل دینے میں بھی دو سال کا عرصہ لگ گیا —— مگر ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے لئے صرف اڑھائی مہینے دیئے گئے ——"

اس میں کسی شے کی گنجائش نہیں کہ یہ سب کچھ پاکستانی قائدین کے لئے مشکلات پیدا کرنے کی غرض سے کیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ انہیں معاملات کی استواری کا وقت نہ دیا جائے ہندوستان کی آزادی سے متعلق برطانوی پارلیمنٹ کے قانون کی نقل اس کی منظوری سے قبل نہرو تک پہنچا دی گئی —— مگر مسلمانوں اور ان کے زعماء کو ان خفیہ اقدامات کا علم تک نہیں ہوا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اپنی پریس کانفرنس میں عجلت کی اہمیت کا ذکر ضرور کیا تھا مگر یہ بات کسی کے ذہن و گمان میں بھی نہ تھی کہ یہ عجلت برطانوی حکومت کی طرف سے انتقال اقتدار کے لئے مقرر کردہ تاریخ کو دس ماہ سے آگے بڑھا دے گی۔ اور یہ عمل جون اڑتالیس کو مکمل ہونے کی بجائے اگست سینتالیس ہی میں مکمل کر دیا جائے گا۔ ہندوستان کی آزادی کا خیر مقدم کرنے والے تو بہت تھے۔ مگر دنیا کے نقشے پر نمودار ہونے والے اس نئے ملک کو کسی نے خوش آمدید نہ کہا۔ برطانوی وزیراعظم نے

بھی دس جولائی سینتالیس کو برطانوی دارالعوام میں تقریر کرتے ہوئے اس نئے ملک کا کھلے دل سے خیر مقدم کرنے کی بجائے اس توقع کا اظہار کیا تھا کہ یہ تقسیم دیر تک تاب آور ثابت نہیں ہو گی۔ اور یہ دو ملک جن کے قیام کی تجویز ہے مستقبل میں اکٹھے ہو کر ایک متحدہ ریاست کی حیثیت سے برٹش کامن ویلتھ کے رکن بن جائیں گے۔ سیکریٹری آف سٹیٹ فار انڈیا نے بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کیا۔ اس نے کہا۔ امید کی جاتی ہے کہ جب تجربہ تقسیم کے نقصانات کو اجاگر کر دے گا تو یہ دونوں ڈومینین پھر انڈین ڈومینین کی صورت میں سامنے آئیں گی۔

تقسیم ——— پس منظر

اسلام برصغیر میں

ہر ملک ملک ماست کہ ملک خدائے ما است

فریڈم ایٹ مڈ نائٹ کے مصنفین لیری کولنز اور ڈ ینیک لا ہیر کا کہنا ہے کہ جناح کی دنیاوی رویت میں قرآن اور خدا کے لئے کوئی جگہ نہ تھی۔ پاکستان کے بانی کے متعلق غیر مسلم مصنفین کا عام طور پر یہی خیال رہا ہے۔ قائد کے مسلمان مخالفین بھی اسی قسم کے خیالات کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ قائداعظم پر یہ الزام پاکستان کے خلاف ایک دلیل کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ اس ریاست کا اسلام سے کیا تعلق ہو سکتا ہے جبکہ اس کا مطالبہ کرنے والے قائدین تمام کے تمام زندیق اور ملحد ہیں۔

یہ سچ ہے کہ قائداعظم اپنے مذہب کو اپنی پیشانی پر چسپاں کئے نظر نہیں آتے تھے۔ نہ وہ مذہبی عالم تھے۔ نہ مولوی۔ نہ مولانا۔ مگر یہ کہہ دینا کہ وہ مذہب سے لاتعلق تھے اور اپنے ہم مذہبوں کی امنگوں سے آگاہ نہیں تھے سراسر بہتان ہے۔ برصغیر کے مسلمانوں کے لئے قائداعظم کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ ان کے متعلق کچھ کہنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے پاکستان کے مطالبے پر حیرت کا اظہار اور اس کی مخالفت ڈاکٹر اشتیاق قریشی کے کہنے کے مطابق ایک ایسے لفظ کے ظلم سے منسلک ہے جسے مسلمانوں نے خود ایجاد کیا اور جو اپنی معنوی حیثیت کے اعتبار سے سینتالیس تک زندہ رہا جس کے بعد اسے تبدیل کر کے بھارت بنا دیا گیا۔ ڈاکٹر اشتیاق کہتے ہیں کہ تاریخی اعتبار سے ہندوستان اس علاقے کا حصہ ہے جو آج کل پاکستان کے زیر تسلط ہے کیونکہ دریائے سندھ اسی علاقے کو سیراب کیا کرتا تھا۔ انڈس کو پاکستان میں سندھ کہا جاتا ہے اور دریا کا نام علاقے کے نام سے وابستہ ہے اور یہ کہنا غلط ہے کہ دریا کے نام سے علاقے کا نام اخذ کیا گیا ہے۔ عربوں کے برصغیر میں ورود کے وقت دریائے سندھ کو مہران کہا جاتا تھا۔ عرب فتوحات کے بعد سندھ کے نام کا اطلاق آج کل کے صوبہ سندھ سے پرے کے

علاقے پر بھی ہوتا تھا۔ سندھ اور ہند ایک دوسرے کے مترادف الفاظ تھے آہستہ آہستہ ان دونوں الفاظ میں امتیاز سا پیدا ہو گیا اور مسلمان ہندوستان کے لئے ہند کا لفظ استعمال کرنے لگے۔ ہند کا تصور حقیقت میں مسلمانوں کی تخلیق ہے کیونکہ ان کے اقتدار سے پہلے برصغیر کے مختلف علاقے مختلف ناموں سے پہچانے جاتے تھے۔ ہند کا لفظ یوں مقبول ہوا کہ مسلمانوں کے پاس اس کے لئے کوئی مقامی متبادل موجود نہ تھا۔ یہ علاقہ جسے آج کل بھارت کہا جاتا ہے ان دنوں سیاسی طور پر متحد نہیں تھا۔ یہ بہت سے ممالک اور بہت سی ریاستوں کا مجموعہ تھا۔ ہر ایک کی اپنی زبان اپنا کلچر اور اپنی رسوم تھیں۔ مگر ان تمام میں ایک مخصوص یکسانی ضرور پائی جاتی تھی کیونکہ ان کا تعلق ایک تہذیب سے تھا۔ اسی یکسانی کی وجہ سے مسلمانوں نے سارے علاقے کو ہند کا نام دے دیا۔

عرب اور ہند کے تعلقات ظہور اسلام سے پہلے سے قائم ہیں۔ عام لوگوں کا خیال ہے کہ عرب پہلے سندھ میں وارد ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی تجارتی کوٹھیاں اور نو آبادیاں ہندوستان کے مغربی ساحل پر ایک مدت سے موجود تھیں۔ عرب کے باشندوں نے اسلام قبول کیا اور ہندوستان کے جنوب مغرب میں قائم عرب نو آبادیاں اسلام کے معلوماتی مراکز میں تبدیل ہو گئیں۔ عرب تاجروں کا اسلام قبول کر لینا ان کے رویے اور ان کی عادات اور معاملات میں واضح تبدیلی سے ظاہر ہو گیا ہو گا۔ اسلام کے اتساع پر تحقیق کرنے والے مغربی دانشوروں کا کہنا ہے کہ عرب تاجر اس تبدیلی سے اس قدر دلدادہ تھے کہ اس کے متعلق برملا اعلان کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے تھے۔ یہ زمانہ مذہبی مباحثوں' مذہبی مذاکرات اور مذہبی نزاع کا تھا۔ برہمنیت' بدھ مت اور جین مت کے خلاف نبرد آزما تھی۔ ان دونوں مذاہب کو شمال سے راہ فرار اختیار کرنے پر مجبور کر دیا گیا تھا اور جنوب میں اپنا دفاع کرنے پر مجبور تھے۔ ان پر سیاسی دباؤ بھی تھا اور انہیں دوسرے طریقوں سے بھی ہراساں کیا جا رہا تھا۔ برہمنیت اور بدھ مت اور جین مت کے درمیان چپقلش بہت سی حکایات کا موضوع رہی ہے۔ ایک خاص مکاتب ایک جین بادشاہ باندیا سے متعلق ہے جس نے مباحثے میں جین پنڈتوں اور عالموں کے لاجواب ہو جانے کے بعد ہندو دھرم اختیار کر لیا تھا۔

اسلام سے ان دنوں ہندو مت کو کوئی خطرہ نہیں تھا۔ اس کی کوئی سیاسی حیثیت

نہیں تھی۔ عربوں کا علاقوں کی تجارت پر بلا شرکت غیر قبضہ تھا۔ ان کی موجودگی ہندو راجوں اور ان کی رعایا کے لئے سود مند تھی۔ ہندو ان دنوں بیرونی ممالک میں جانے سے کتراتے تھے اور انہیں جہاز رانی سے بھی کوئی لگاؤ نہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ بیرون ملک ذات پات کی وہ تمیز جو ان کے ملک میں ان کے مذہب کا جزو لاینفک تھی بیرون ملک قائم نہیں رہتی۔ شاید یہی خدشہ جہاز رانی سے لاحق تھا۔ چونکہ عرب تاجر انہیں بھرپور فائدہ پہنچا رہے تھے اس لئے ان کا تحفظ ہندو حکمران اپنی خصوصی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ شمالی افریقہ اور مغربی ایشیا میں عربوں کی فتوحات نے انہیں تجارت کے لاتعداد مواقع فراہم کر دیئے تھے اور اس بڑھتی ہوئی تجارت سے ہندوؤں کی خوشحالی میں اضافہ ہو رہا تھا۔ عربوں نے جنوبی ہند میں کارومنڈل کے علاقے کو معبر کا نام دیا تھا جو غالباً بعد میں بدل کے مالا بار بن گیا۔ عربی میں معبر شاید راستے۔ پل یا ایسی کشتی کو کہتے ہیں جس پر سوار ہو کر مسافر دریا پار کرتے ہیں۔

مسلمانوں کو اپنے انداز سے عبادت کی اجازت تھی اور انہیں حکام سے کوئی شکایت بھی نہیں تھی۔ ان کا احترام کیا جاتا تھا اور وہ مقامی سیاست سے لاتعلق تھے۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ ان کی قلیل تعداد نہ تو مقامی افواج کا مقابلہ کرنے کی اہل تھی اور نہ ہی ان علاقوں میں کوئی انقلاب برپا کر سکتی تھی۔ عربوں کی طرف سے ہندوستان کے ساحلی علاقوں میں پہلی مسلح مداخلت پچاس ہجری یعنی 638ء میں ہوئی تھی۔ اس کے بعد حضرت عمرؓ کے حکم سے یہ مداخلت ختم کر دی گئی تھی ایک روایت یہ ہے کہ ایک مسلمان کشش سید ابراہیم شاہد نے پانڈیا کے بادشاہ کو شکست دے کر وہاں اپنی حکومت قائم کر لی تھی۔ بعد کو ان پر حملہ کر کے انہیں شکست دی گئی اور وہ اس جنگ میں شہید ہو گئے۔

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ عربوں کو مقامی آبادی سے کچھ لوگوں کو حلقہ اسلام میں داخل کرنے کی اجازت اس غرض سے دی گئی تھی تاکہ انہیں جہاز رانوں کی حیثیت سے تربیت دی جا سکے۔ عربوں نے مقامی خواتین سے شادیاں بھی کیں۔ جن کا تعلق عام طور پر اونچی ذات کے طبقوں سے تھا۔ یہ شادیاں نائر عورتوں سے کی جاتی تھیں اور ان رشتوں نے مالا بار میں موپلا نامی ایک نئی مسلمان نسل کو جنم دیا۔ جس کی دلیری اور بہادری کے افسانے زبان زد خاص و عام رہے ہیں۔ ایک حکایت یہ ہے کہ مالا بار کا مہاراجہ پیرومل

مسلمان ہو کے عرب منتقل ہو گیا تھا۔ اس نے اپنے لواحقین کو ہدایت کی تھی کہ علاقے کے مسلمانوں کا احترام کیا جائے اور انہیں تمام سہولتیں فراہم کی جائیں۔ یہ سنا جاتا ہے کہ ٹراونکور کا مہاراجہ جو اس شخص کی نسل سے تھا ریاست کے ہندوستان میں مدغم ہو جانے تک رسم تاجپوشی کے وقت تلوار وصول کرتے ہوئے یہ کہا کرتا تھا کہ یہ تلوار اس بزرگ کی امانت ہے جو مکہ شریف منتقل ہو گیا ہے اور اس کی واپسی پر اسے لوٹا دی جائے گی۔

اسلام کا شمال میں اس انداز سے استقبال نہیں کیا گیا جس انداز سے جنوب میں ہوا تھا۔ گو عرب جہازوں میں ہندو بنیوں (اور انہیں ان دنوں بھی بنیا ہی کہا جاتا تھا) کے سفر کی داستانیں عام تھیں مگر سندھ میں اسلام کے ورود کو ہندوؤں نے عام طور پر پسند نہیں کیا۔ وہاں بھی بدھ مت اور برہمنیت کی کشمکش جاری تھی۔ برہمن کے نظام سے بدھ مت کے پیروکار تنگ آ چکے تھے اور انہوں نے مسلمانوں کا نجات دہندہ کی طرح استقبال کیا۔ جنوب میں عرب تاجر مقامی سیاست میں مداخلت سے گریز کرتے تھے۔ انہیں ہندو حاکم نے قبول کر لیا۔ سندھ میں عرب فاتح کی حیثیت سے نمودار ہوئے۔ انہوں نے سندھ پر قبضہ کر لیا انہیں بدھ مت کے ماننے والوں کی اعانت ملی۔ ان میں سے بہت سوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ہندوؤں کی مسلمانوں سے پرخاش قدرتی امر تھا۔ وہ آئے تو تھے راجہ داہر کو اس کی زیادتیوں کی سزا دینے۔ اگر راجہ داہر بحری قزاقوں کے قلع قمع کا خود اہتمام کر لیتا تو ممکن ہے یہ مہم ترک کر دی جاتی۔ مگر اس نے یہ کہہ کر حجاج کو ٹالنے کی کوشش کی کہ بحری قزاقوں کی بیخ کنی اس کے بس کی بات نہیں۔

چچ نامہ کے علی کوفی کے فارسی ترجمہ میں لکھا ہے کہ سراندیپ سے خلیفہ کے لئے کچھ تحائف جو بہت قیمتی تھے بھجوائے گئے ان کے ہمراہ کچھ حبشی غلام بھی تھے اور کچھ مسلمان عورتیں بھی جو خانہ کعبہ کی زیارت کے لئے (غالباً عمرہ کے لئے) سراندیپ تحفوں سے بھرے ہوئے اسی جہاز پر روانہ ہوئیں۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ جس طرح عرب تاجروں نے ہندوستان کے مغربی ساحلوں پر نو آبادیاں قائم کر رکھی تھیں اسی طرح عرب سراندیپ میں بھی مقیم تھے۔ اور انہوں نے مقامی خواتین سے شادیاں کی تھیں۔ ممکن ہے ان میں سے کچھ نے جو مسلمان ہو چکی ہوں یا ان کی اولاد میں سے کسی نے خانہ کعبہ

کی زیارت کی خواہش کی ہو اور انہیں بھی ان کی خواہشات کے مطابق دارالخلافہ دیکھنے کے لئے اور کعبے کی زیارت کے لئے جہاز کے ذریعہ خلیفہ کے دارالحکومت بھجوانے کا انتظام کیا گیا ہو (ایک اور جگہ یہ بھی کہا گیا ہے کہ سراندیپ یعنی سری لنکا جسے مسلمان مورخین نے نیپالیوں کا دیس بھی کہا ہے سے کچھ مسلمان لڑکیاں جن کے مسلمان والد سری لنکا میں قیام کے دوران رحلت کر گئے تھے سری لنکا سے حجاج کے پاس شاید اس لئے بھجوا دی تھیں کہ مسلمان ملک میں مسلمانوں کے ساتھ ان کی بہتر دیکھ بھال ہو سکے گی) باد مخالف نے جہاز کا رخ پھیر دیا اور جہاز کو طوفان سے پناہ لینے کے لئے دیبل میں لنگر انداز ہونا پڑا۔ دیبل بحری قزاقوں کا شہر تھا۔ سامان پر بھی قبضہ کر لیا گیا اور عورتیں بھی محبوس کر دی گئیں۔ حجاج کو جب اس بات کا علم ہوا تو راجہ داہر کو خط لکھا گیا اور اسے کہا گیا کہ مسلمان عورتوں کو فوری رہا کرو اور وہ تمام تحائف واپس کرو جو لوٹ لئے گئے ہیں۔ راجہ داہر کا جواب تسلی بخش نہیں تھا۔ محمد بن قاسم کو جس کی عمر اس وقت صرف سترہ سال تھی داہر کی سرکوبی کے لئے بھیجا گیا۔ داہر نے شکست کھائی اور مسلمانوں نے آہستہ آہستہ سارے سندھ پر قبضہ کر لیا۔

تاریخ کہتی ہے کہ بدھ مت کے پیروکاروں نے برہمنوں کے خلاف مسلمانوں کی اعانت کی۔ بودھوں کے مسلمانوں سے تعاون کی بہت سی مثالیں موجود ہیں۔ دیبل پر حملے کے دوران مندر کے جھنڈے اور کلس کو نشانہ بنانے کا مشورہ محمد بن قاسم کو ایک بودھ بھکشو ہی نے دیا تھا۔ دیبل میں مقید عربوں سے رابطہ بھی ایک بودھ ہی کے ذریعہ ہوا تھا۔ بودھوں نے ہندوستان کے حاکم کو جو راجہ داہر کا قریبی عزیز تھا بھی مشورہ دیا تھا کہ وہ مسلمانوں کے خلاف ہتھیار نہ اٹھائے۔ اس نے بودھوں کی بات ماننے سے انکار کیا اور شکست کھائی۔ مسلمانوں کو بودھوں کا تعاون ضرور حاصل رہا۔ بہت سے بودھ مسلمان بھی ہو گئے۔ مگر مسلمانوں کی فتح سے برہمنیت ختم نہیں ہوئی۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو مذہب کی تبدیلی کے لئے مجبور نہیں کیا۔ مسلمانوں نے برصغیر پر ایک ہزار سال کے قریب راج کیا۔ اگر وہ تبدیلی مذہب کے لئے تلوار کا استعمال کرتے جیسا کہ ان پر الزام لگایا جاتا ہے تو سینتالیس میں برصغیر کی تقسیم کی ضرورت محسوس نہ ہوتی۔ برصغیر میں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہوتی اور انگریز حکومت ان کے حوالے کر کے چپکے سے رخصت ہو جاتے۔

نہ تو ہندوستان کا اتحاد برقرار رکھنے کے لئے سازشیں کی جاتیں نہ دس بیس لاکھ انسانی جانیں ضائع ہوتیں۔

سندھ میں عرب حکومت کے قیام کے ساتھ ہی مساجد، مدرسے اور دانش گاہیں نظر آنے لگیں۔ سندھ میں مسلمانوں کی نوآبادیاں بھی قائم ہو گئیں۔ ان میں سے ایک کا نام منصورہ تھا جس کی بنیاد محمد بن قاسم کے بیٹے عمر نے رکھی تھی۔ اسے سندھ میں مسلمان حکمرانوں کا اولین دارالحکومت ہونے کا شرف حاصل ہے۔ سندھ کو جب مختلف امارات میں تقسیم کر دیا گیا تو منصورہ ان نئی امارات میں سے ایک کا دارالحکومت رہ گیا۔ محمود غزنوی کے اس پر قبضے سے کچھ پہلے یہ اسماعیلی فرقے کا گڑھ بن چکا تھا۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اسماعیلیوں نے اس پر کیسے قبضہ کیا۔

ملتان پر بھی مسلمانوں نے قبضہ کر لیا۔ عرب فتح کے وقت ملتان ایک بارونق اور اہم شہر تھا۔ مسلمانوں کو اسے فتح کرنے کے لئے اس کا طویل محاصرہ کرنا پڑا۔ شہر کو فتح کرنا مشکل نظر آ رہا تھا۔ کہتے ہیں ایک مقامی باشندے نے فصیل کے ایک کمزور مقام کی نشاندہی کر کے مسلمان افواج کو شہر میں داخل ہونے کا راستہ فراہم کر دیا۔

غزنوی کے حملوں نے سندھ کے پڑوس میں اسلام کے پھیلاؤ کے لئے راہ ہموار کر دی۔ شمال میں اسلام کو قدم جمانے کا موقع ملا تو اس کی تشہیر کا اہتمام بھی ہونے لگا۔ ہندوؤں کے زمانے میں تاریخ رقم کرنے کا اہتمام نہیں تھا۔ مسلمان برصغیر میں آئے تو حالات اور واقعات ضبط تحریر میں آنے لگے۔ غزنویوں کے متعلق تو تاریخی کتابوں میں بہت کچھ ملتا ہے۔ اور سلطان محمود غزنوی کے عہد میں تخلیق ہونے والے ادب سے ان دنوں کی روداد کا مورخ کو علم ہو جاتا ہے۔ سلطان محمود اور اس کے جانشین سب کے سب اہل بصیرت حکمران تھے۔ ابو نصر محمد بن عبدالجبار العبیتی کی عربی میں لکھی جانے والی تاریخ گو اس میں دی جانے والی تاریخیں اتنی قابل اعتبار نہیں اور نہ ہی اس میں واقعات اور حالات کی تفصیل موجود ہے مگر کتاب اہم ضرور سمجھی جاتی ہے۔ محمود غزنوی نے ہندوستان پر متعدد بار حملہ کیا۔ محمد بن قاسم کے بعد مجاہدین میں سے کوئی شخص ترکوں کے عہد تک کابل کی سرحد اور دریائے مہران سے آگے نہیں بڑھا۔ مگر ساسانیوں کے زمانے میں جب ترک غزنی کے حاکم بنے اور سبکتگین کو نائب سلطنت مقرر کیا گیا تو اس نے جنگ

کو مشغلہ بنا کر غازی کا لقب اختیار کرتے ہوئے اپنے جانشینوں کے لئے ہندوستان کی طرف جانے والے راستے یوں ہموار کئے کہ جن پر محمود اور اس کی افواج تیس سال تک بغیر کسی رکاوٹ کے سفر کرتی رہیں محمود نے ان حملوں سے ہندوستان کی سرزمین پر کچھ ایسے کارنامے سرانجام دیئے جن سے البیرونی کے کہنے کے مطابق ہندو غبار کی طرح پراگندہ ہو گئے۔ صرف ان کے افسانے باقی رہ گئے۔ جو لوگ ان حملوں کی تباہیوں سے بچ کر نکل گئے انہیں مسلمانوں سے اس قدر نفرت ہو گئی کہ وہ ان کی شکل دیکھنے کے روادار نہ تھے۔ اور ان کے علوم اور فنون بھی ان علاقوں سے نکل کر بنارس اور کشمیر منتقل ہو گئے، جہاں اجنبیوں کے ساتھ تعلق نہیں رکھا جاتا۔

پنڈت نہرو نے اپنی کتاب ڈسکوری آف انڈیا میں فارسی کی ایک تصنیف "تاریخ سوارث" (جسے فارسی سے ان چھوڑا مرجی نے 1892ء میں ترجمہ کر کے شائع کرایا) کے حوالے سے ایک عجیب واقعے کا ذکر کیا ہے جس پر اسے خود بھی یقین نہیں۔ کہا گیا ہے کہ محمود غزنوی شکست کے بعد بمشکل تمام اپنی جان بچا کر بھاگا مگر اس کے لشکر کے بے شمار افراد جن میں خواتین بھی شامل تھیں گرفتار کر لئے گئے۔ ترک، افغان اور مغل عورتیں جو دوشیزہ تھیں ہندوستانی سپاہیوں کی بیویاں بن گئیں۔ وہ جو دوشیزہ نہیں تھیں ان کے حصے جلاب سے صاف کئے گئے اور پھر انہیں ان کے ہم مرتبہ ہندوؤں سے بیاہ دیا گیا۔ مرد قیدیوں میں ان کو جو معتبر اور صاحب وقار سمجھے گئے داڑھیاں منڈوانے پر مجبور کر دیا گیا اور انہیں راجپوتوں کے شیخاوت اور دوھیل قبائل میں شامل کر لیا گیا اور دوسروں کو کمتر ذاتوں کے افراد کے حوالے کر دیا گیا پنڈت نہرو کہتے ہیں کہ انہوں نے اس واقعے کی تفصیل کے ایم منشی کی گجرات سے متعلق تصنیف سے حاصل کی۔

اور ایک دنیا جانتی ہے کہ منشی بے حد متعصب تھے۔ کے ایم منشی اور رن چھوڑا مرجی کی تصانیف کے علاوہ اس واقعے کا ذکر کسی اور تاریخ میں نہیں ملتا۔ ان میں صرف مسلمانوں ہی کی لکھی ہوئی تاریخیں نہیں ہندوؤں کی تحریر کردہ تاریخیں بھی ہیں۔ پنڈت نہرو کا یہ بھی کہنا ہے کہ محمود غزنوی کو مذہب کی بجائے جنگ سے زیادہ لگاؤ تھا۔ وہ محارب تھا اور محارب عام طور پر مذہب کو اپنے مقاصد کے حصول کے لئے استعمال کرنے کے قائل ہوتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اس نے اپنی ایک فوج ہندوستان میں ترتیب دے

کر اس میں ہندوستانی بھرتی کئے اور تلک نامی ایک ہندو ان کی اس فوج کا جرنیل تھا اور انہوں نے اس فوج کو وسط ایشیا میں مسلمانوں کے خلاف استعمال کیا۔ پنڈت نہرو کی یہ کتاب 1946ء میں شائع ہوئی اور غزنوی سے متعلق ان کے مندرجات کی تردید کسی مسلمان مورخ کی طرف سے میری نظر سے نہیں گزری چونکہ کتاب ہندوستان کے ایک اہم قائد کی لکھی ہوئی ہے اس لئے بڑے شوق سے پڑھی گئی ہو گی اور چونکہ اس کا تعلق ہندوستان کے تاریخی منظرنامے سے ہے اس لئے امکان ہے کہ مسلمان دانشوروں نے بھی اس کا مطالعہ کیا ہو گا۔ اس سانحے میں مغل عورتوں کا ذکر جبکہ مغل برصغیر میں کئی سو سال بعد نمودار ہوئے۔ اس کی تکذیب کے لئے کافی ہے۔ ہندو شاہی خاندان سے جنگ کے بعد حاصل کئے ہوئے علاقے جے پال کے پوتے سکھ پال کے جو مسلمان ہو گیا تھا حوالے کر دیئے گئے۔ محمود کے جانے کے بعد سکھ پال نے اسلام کو خیرباد کہہ کے پھر ہندو مت اختیار کر لیا۔ محمود نے ہندو شاہی خاندان کی غداری کے بعد پھر انند پال پر حملہ کرنے کا منصوبہ بنایا۔ انند پال نے برصغیر کے لاتعداد ہندو راجوں مہاراجوں سے مدد طلب کی۔ اجین، گوالیار، کالنجر، قنوج، دہلی اور اجمیر کے ہندو حکمرانوں نے انندپال کی اعانت کے لئے اپنی افواج محمود کے مقابلے کے لئے بھجوا دیں۔ برصغیر کے شمال میں سندھ کے معرکے کے بعد کفر و اسلام کی یہ سب سے بڑی جنگ تھی۔ ہندو عوام میں مذہبی جوش و خروش دیدنی تھا۔ عورتوں نے افواج کے اسلحہ کی خریداری کے لئے اپنے زیورات فروخت کر ڈالے۔ پشاور اور ہند کے درمیان کی جگہ پر دونوں فوجوں کے درمیان خونریز معرکہ ہوا۔ وہ ہاتھی جس پر انند پال سوار تھا گھبرا کر میدان جنگ سے بھاگ کھڑا ہوا۔ ہندو سپاہ کے قدم اکھڑ گئے۔ وہ افراتفری کے عالم میں بھاگے۔ مسلمانوں نے ان کا تعاقب کیا اور فرار ہونے والے لاتعداد سپاہی مارے گئے۔ ہند عمدیہ کی افواج کو شکست فاش ہوئی۔ محمود غزنوی کا سب سے مشہور حملہ سومنات کا سمجھا جاتا ہے۔ یہ کاٹھیاواڑ میں سمندر کے ساحل پر واقع تھا۔ اس مندر کے پاس بے پناہ دولت تھی۔ اڑوس پڑوس کے دس ہزار گاؤں کی آمدنی اس کے لئے وقف تھی۔ سومنات کے بت کی پرستش کے لئے ایک ہزار برہمن ہروقت مندر میں موجود رہتے تھے۔ اور پانچ سو دیوداسیاں اس کے دروازے پر رقص و سرود میں مصروف رہتی تھیں۔ ہندوؤں کو یہ یقین تھا کہ سومنات (بعض لوگوں کا

خیال ہے کہ اس نام کا تعلق خانہ کعبہ میں حضورؐ کی بعثت سے قبل رکھے ہوئے لات و منات سے تھا۔ بعض دوسرے سومنات سے مراد چاند دیوتا لیتے ہیں) ترکوں کو نیست و نابود کر دے گا۔ محمود نے اس قلعے پر 1025ء میں حملہ کیا۔ مگر ملک بھر سے اکٹھی ہونے والی راجپوت افواج نے حملہ آوروں کو آگے بڑھنے نہیں دیا جب محمود نے یہ محسوس کیا کہ فتح کا امکان کم ہے تو اس نے خدا کے حضور گڑگڑا کے دعا کی۔ اور دشمن کے خلاف اس کی اعانت کی استدعا کی۔ اس سے اسے اور اس کے سپاہیوں کو نیا عزم اور نیا حوصلہ ملا جنہوں نے فتح کے لئے موت تک کو قبول کرنے کا عزم کر لیا ہندو افواج کو پھر شکست ہوئی۔ وہ پسپا ہوئیں تو محمود مندر میں داخل ہوا جس کی چھت چھپن ستونوں پر مستحکم تھی مسلمانوں کے ہاتھ اتنی بہت دولت لگی جس کا ذکر تک مبالغہ معلوم ہوتا ہے۔ محمود کو بت کو نقصان نہ پہنچانے کی صورت میں اور دولت کی پیش کش کی گئی۔ اس نے بت فروش کہلانے کی بجائے بت شکن کہلانا بہتر سمجھا اور سومنات کے بت کو پاش پاش کر دیا۔

سومنات کی فتح نے جہاں اسلامی دنیا میں محمود کو ایک نئی عظمت ودیعت کی۔ وہاں ہندو دنیا کے اعصاب کو شل کر دیا ان کا مورال اس قدر گر گیا کہ انہیں اپنے اوپر اعتماد نہ رہا۔ پنڈت نہرو کے کہنے کے مطابق اگر محمود کے پاس ہندو فوج ہوتی تو ہندو کنشدمی کی شکست اور سومنات پر مسلمانوں کی یلغار ان سے برداشت نہ ہو سکتی تھی۔ فوج میں بغاوت ہو جاتی۔ اگر یہ سانحہ وسط ایشیا میں پیش آتا تو محمود کی توجہ ہندوستان سے ہٹ جاتی اسے اپنے مفادات کی نگہداشت کے لئے وسط ایشیا جانا پڑتا۔ اور ہندوستان میں مسلمانوں کے ساتھ مل کر ہندو فوج کا ہندو کنفیڈریسی یعنی ہند عمدیہ کے خلاف نبرد آزما ہونا اور برصغیر کے سب سے اہم بت کی تباہی کے لئے سومنات پر حملہ ناقابل فہم ہی نہیں ناممکن امر ہے۔ خاص طور پر اس وقت جب البیرونی کے کہنے کے مطابق ہندوؤں کا اعتقاد ہے کہ ملک ہے تو ان کا ملک۔ انسان ہیں تو ان کی قوم کے لوگ۔ بادشاہ ہیں تو ان کے بادشاہ اور سب سے اہم یہ کہ دین ہے تو وہی افضل و اعلیٰ اور برتر ہے جو ان کا مذہب ہے۔ اور جو علم ان کے پاس ہے وہ دنیا میں کسی اور کے پاس نہیں۔ ہندوؤں کی خود پسندی کسی صورت ہندو افواج کو مسلمانوں کی اعانت کی اجازت نہ دے سکتی تھی۔ مسلمان تو ان کے اپنوں کے خلاف برسرپیکار تھے۔ ان بتوں کو توڑنے میں مصروف تھے جن کی پرستش ہندوؤں کے

اسلام پہلے جنوبی ہند میں وارد ہوا۔ پھر مسلمان سندھ پر قابض ہو گئے۔ اس کے بعد اسلام نے برصغیر کے شمال مغربی علاقوں پر تسلط جمالیا ـــــ

مسلمان تاجر جس طرح ہندوستان کے مغربی ساحل پر آ کے آباد ہوئے تھے۔ اسی صورت ان کے چٹاگانگ تک پہنچنے کے شواہد ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ مسلمانوں کا ایک جہاز بہا میں اراکان جاتے ہوئے طوفان کی نذر ہوا اور جہاز میں سوار عرب چٹاگانگ جا پہنچے۔ وہاں انہوں نے مقامی عورتوں سے شادیاں رچائیں اور وہیں کے ہو کے رہ گئے۔ اس قسم کی اور بہت سی حکائتیں بھی ہیں جن کا تعلق بنگال میں مسلمانوں کی آمد سے ہے۔ ممکن ہے ان روائتوں میں کچھ حقیقت ہو مگر تاریخ ان کے متعلق خاموش ہے۔ برصغیر میں مسلمانوں کی آمد کے بعد کے تاریخی شواہد ہی پر اعتبار کیا جا سکتا ہے ـــــ اس میں کلام نہیں کہ بودھ مت بنگال میں مغرب کی بہ نسبت برہمنیت کی یلغار کے باوجود زیادہ دیر تک زندہ رہا۔ بنگال میں بودھ مت اور برہمنیت کی کشمکش کی جولا نگاہ بنا رہا تھا۔ بدھ مت نے پہلے پہل تو ہندو مت کو بنگال سے دھکیل باہر کیا۔ سینا خاندان کے عہد میں ہندو مت کا احیاء ہوا۔ سینا حکمرانوں سے بدھ مت کی چپقلش عام طور پر پرامن نہیں تھی۔ انہوں نے بدھ مت کے پیروکاروں پر بھی تشدد بھی کیا۔ ان پر جبر بھی روا رکھا گیا اور ان کی سرعام تذلیل بھی کی گئی۔ ہندوؤں سے ان کی نفرت کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے مسلمانوں کو نجات دہندہ سمجھ کر ان کا خیر مقدم کیا۔ ان کی تصانیف میں برہمنیت کے ظلم و ستم کی روداد بڑے واضح الفاظ میں تحریر ملتی ہے۔ ایک انتہائی دلچسپ واقعے کی کہانی ان کی ایک اہم تصنیف میں لکھی گئی ہے۔ کہتے ہیں کہ برہمنوں نے بودھوں سے اپنے مذہب کے لئے رقم کا مطالبہ کیا۔ بودھ یہ رقم ادا نہ کر پائے تو ان کے خلاف احباف سے کام لیا گیا۔ ایذا رسانی کے لئے ان پر حملہ کر دیا گیا بودھ خوفزدہ تھے۔ ان کے پاس فرار کا کوئی راستہ نہ تھا۔ انہوں نے اپنے "دھرما" سے مدد کی دعا کی۔ اور اپنی غلامی کی التماس کی ان کی دعاؤں کے جواب میں "دھرما" مسلمان کے روپ میں نمودار ہوا۔ آسمان پر بودھ دیوتاؤں نے اسلام کے بزرگوں کا روپ دھارا۔ مصنف کو چونکہ اسلام سے پوری واقفیت نہ تھی اس نے اپنے انتہائی اہم دیوتاؤں کو اسلام کے اہم بزرگوں کا روپ دیا اور چھوٹے دیوتا صوفیاء کے لباس میں سامنے آئے۔ اور اسلام کے بزرگ ہندوؤں پر ٹوٹ پڑے اور

لئے باعث فخر تھی۔ اور اسی طرح "تاریخ سوراٹ" میں محمود کی شکست اور افغان مغل اور ترک عورتوں اور مردوں کی گرفتاری محض خوش فہمی کا شاخسانہ معلوم ہوتی ہے کیونکہ تاریخ شاہد ہے کہ محمود نے کبھی شکست نہیں کھائی۔

محمود کی تشکیل دی ہوئی سلطنت تو اس کی موت کے بعد بہت جلد انتشار کا شکار ہو گئی۔ مگر پشاور سے لاہور تک کے علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ برقرار رہا۔ ہندو راجاؤں نے انہیں علاقوں سے نکالنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ مگر انہیں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ انہیں کچھ اور علاقہ بھی مسلمانوں کے حوالے کرنا پڑا۔ مسلمان اجودھن (موجودہ پاکپتن) تک جا پہنچے۔ اور پھر مسلمانوں کی آپس میں چھڑ گئی۔ سلجوقیوں اور غزنویوں کی عداوت نے ہرات اور کابل کے درمیان غشینہ خاندان کے شہزادوں کو میدان عمل میں آنے کی دعوت دی۔ اور یوں غوریوں اور غزنویوں کی ٹھن گئی۔ غزنویوں سے بہت سے علاقے چھن گئے۔ پشاور اور پنجاب ان کے قبضہ میں رہ گئے۔ اور ان علاقوں پر ان کی حکومت کوئی دو سو سال تک قائم رہی۔

اسلام کے قدم تو برصغیر میں جم گئے۔ مگر اسے لاتعداد مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ مسلمان مسلمانوں سے لڑتے رہے۔ غزنویوں کے بعد غوری آئے۔ پھر خاندان غلاماں برسراقتدار آیا۔ ترک سلطان دہلی پر قابض رہے۔ آپس کے لڑائی جھگڑے جاری رہے۔ اور پھر ایک ایسا طوفان اٹھا جس نے اسلامی دنیا کو تباہی کے کنارے پہنچا دیا۔ اس سے منسلک غارت گری۔ اخلال۔ ہیبت ناک درندگی۔ بے مقصد قتل و غارت۔ اور بہیمیت۔ جس کا مظاہرہ منگولوں نے کیا انسانی زندگی سے تعلق کا مظہر نہیں بلکہ قدرت کی اندھی قوتوں کی تخلیق معلوم ہوتی ہے۔ منگول چنگیز کی قیادت میں گھروں سے نکلے اور بلخ' بخارا' سمرقند' ہرات کو جلا کر راکھ کرتے چلے گئے۔ جو سامنے آیا قتل کر دیا گیا۔ عورتوں اور بچوں کو بھی نہیں بخشا گیا۔ خوارزم شاہی سلطنت وسط ایشیا کی تاریخ کا جزو بن گئی۔ شہزادہ ولی عہد کو سندھ ساگر دو آب میں پناہ لینی پڑی۔ شہزادہ جلال الدین نے دہلی کے بادشاہ التتمش سے پناہ کی درخواست کی۔ مگر چونکہ اس کے ہمراہ اس کی دس ہزار فوج بھی تھی اس کی درخواست مسترد کر دی گئی۔ خدشہ صرف جلال الدین کے دس ہزار سپاہیوں ہی سے نہیں تھا۔ خدشہ منگولوں کے عتاب کا بھی تھا ـــــ

بودھوں پر ستم ڈھانے کا ان سے انتقام لیا گیا۔ بودھوں نے یوں ہندوؤں کے خلاف اسلام کا سہارا لیا۔ اور چونکہ بودھوں پر برہمن تشدد انتہا کو پہنچ چکا تھا اس لئے اپنے اور اپنے اہل و عیال کے تحفظ کے لئے بودھوں نے اسلام قبول کر کے ہندو سے انتقام کی ٹھانی۔ ان افسانوں سے دو نتیجے اخذ کئے جا سکتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہندو بودھوں سے متنفر تھے اور ان پر تشدد سے گریز نہیں کرتے تھے۔ مذہب کی تبدیلی کے لئے ان پر سیاسی دباؤ کے ساتھ ساتھ سختی بھی کی جاتی تھی۔ اور دوسرے یہ کہ مسلمانوں کو عام طور پر ہندوؤں سے بہتر سمجھا جاتا تھا۔ اور ان کی دلیری کا اعتراف بھی کیا جاتا تھا۔

اسلام برصغیر میں جگہ جگہ پھیل گیا۔ مسلمانوں کی نو آبادیاں ہر صوبے میں نظر آنے لگیں۔ یہ نو آبادیاں عظیم سمندر میں چھوٹے چھوٹے جزیروں کی طرح تھیں۔ انہیں اپنے اڑوس پڑوس کی ہندو آبادیوں سے خطرہ لاحق رہتا تھا۔ ہندو اکٹھے ہو کر جب چاہتے ان پر حملہ کر سکتے تھے۔ ہندوؤں کی بہ نسبت ان کی تعداد کم تھی۔ انہیں اپنی یکجہتی اور اپنے ہتھیاروں پر بھروسہ کرنا پڑتا تھا۔ "مغربی سندھ" پنجاب اور بلوچستان کے علاوہ برصغیر کے دوسرے علاقوں میں مسلمان نو آبادیاں غیر محفوظ تھیں۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ ان کی دلیری کی کچھ ایسی دھاک بیٹھ چکی تھی کہ ان پر حملے سے اجتناب کیا جاتا تھا۔ اور پھر کہ برصغیر میں آباد ہونے والے مسلمانوں کا تعلق ایک ملک سے نہیں تھا۔ ان میں عرب بھی تھے جن کی زبان عربی تھی۔ ایرانی نژاد نو وارد تھے جن کی زبان فارسی تھی اور ترک تھے جو ترکی میں اظہار خیال کرتے تھے۔ اور ان کے علاوہ اپنا مذہب ترک کر کے اسلام قبول کرنے والے بودھ اور ہندو بھی تھے جن کی زبان برصغیر میں آنے والے مسلمانوں کی زبان سے بالکل مختلف تھی۔

مذہب کی تبدیلی کے لئے اگر اسلام تلوار کا استعمال کرتا تو سینتالیس میں پاکستان اور بھارت کا کوئی تنازع کھڑا نہ ہوتا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ فرنگی کو قدم جمانے کی اجازت ہی ملتی۔ نہ تو ہندو اپنی روایات کے مطابق بیرونی حملہ آوروں کو اپنے سماج میں مدغم کرتے اور نہ مسلمان برصغیر کے تمام ہندوؤں کو مسلمان بنانے میں کامیاب ہوتے۔ مسلمانوں نے تبدیلی مذہب کے لئے جبر نہیں کیا۔ صوفیاء اور علماء نے برصغیر کے مختلف علاقوں میں جا کے اسلام پھیلایا اور پاکستان اور بھارت میں جو مسلمان آج کل نظر آتے ہیں ان کا

اسلام انہی صوفیا اور انہی مسلمان مشنریوں کا مرہون منت ہے جنہوں نے اپنی جان اور اپنے آرام کی پرواہ کئے بغیر جگہ جگہ پہنچ کر اسلام کی تشہیر کی اور اپنی گفتار اور اپنے کردار سے لوگوں کو متاثر کر کے برضا و رغبت اسلام قبول کرنے پر آمادہ کیا۔ بعض مورخ کہتے ہیں کہ نیا علاقہ فتح کرنے پر مفتوح لوگوں کو اس صورت میں پناہ کی پیش کش کی جاتی تھی کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ یہ نہیں کہ ایسا نہیں ہوا ہو گا۔ مگر ایسے واقعات کم کم ہی نظر آتے ہیں۔ اور پھر یہ کہ پناہ کے لئے اسلام قبول کرنے والے موقع پرست خطرے کے ٹل جانے کے بعد پھر اپنی اصلیت کی طرف لوٹ جاتے تھے۔ دو چار دس لوگ ہی ایسے ہوں گے جنہوں نے برگشتگی کو پسند کیا ہو ——

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جزیہ کے نفاذ نے ہندوؤں کو مذہب بدلنے کی ترغیب دی کیونکہ اس ٹیکس کی ادائیگی غریبوں کے بس کی بات نہ تھی۔ یہ بجا ہے کہ اسلام قبول کر لینے والے شخص کو جزیہ ادا نہیں کرنا پڑتا تھا۔ مگر یہ سہولت ان غیر مسلموں کو بھی حاصل تھی جو سرکاری ملازم تھے۔ سرکاری ملازمت میں مسلمانوں کی تعداد غیر مسلموں سے زیادہ ضرور تھی مگر غیر مسلموں کے لئے سرکاری ملازمت کے حصول پر کوئی قدغن نہ تھی۔ محمد بن قاسم نے سندھ میں فراخدلانہ حکمت عملی اختیار کی تھی۔ لاتعداد مقامی باشندے۔ بودھ اور ہندو سرکاری ملازم تھے اور شہروں اور قصبوں سے دوران کی تعیناتی نے عوام کے دلوں میں حکومت سے متعلق اعتماد سا پیدا کر دیا تھا اور انتظامیہ کو پھر سے فعال بنا دیا تھا۔ برصغیر میں مسلمانوں کی حکمرانی کے دوران کسی دور میں بھی غیر مسلموں کے دیوانی محکموں اور فوج میں بھرتی پر کوئی پابندی نہیں رہی۔ اکبر نے جزیہ ختم کر دیا۔ مگر اس کی تنسیخ نے اسلام کی مقبولیت پر اثرات مرتب نہیں کئے۔ اسلام بدستور پھیلتا رہا۔ لوگ مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کرتے رہے۔ جزیہ کے اطلاق کے دوران اور اس کے ختم کئے جانے کے بعد تبدیلیوں کی تعداد میں کوئی خاص فرق نہیں آیا۔ صوفیا اور علماء کی تعلیمات سے متاثر ہو کر لوگ اسی صورت مذہب تبدیل کر کے مسلمان بنتے رہے جس طرح غیر مسلموں پر اس ٹیکس کی موجودگی میں کرتے تھے۔ اور پھر یہ کہ جزیہ کوئی ایسا بوجھ نہ تھا جسے غیر مسلم بآسانی اٹھا نہ سکتے۔ اس کا اطلاق صرف ایسے مردوں پر ہوتا تھا جو معذور نہیں تھے جو اپنی روزی کمانے کے اہل تھے اور جن کے پاس خاندان کی کفالت کے

بعد فاضل آمدنی باقی رہ جاتی تھی۔

مختصر یہ کہ ہندوؤں کو مسلمان بنانے کے لئے سرکاری دباؤ استعمال نہیں کیا گیا۔ سرکاری دباؤ استعمال ہوتا تو برصغیر میں مسلمان اقلیت نہ رہتے۔ اگر ان کی آبادی ہندو آبادی سے زیادہ نہ ہوتی تو کم از کم اتنی ضرور ہوتی کہ اسے اپنے حقوق کے لئے اتنی طویل جدوجہد نہ کرنی پڑتی۔ برصغیر پر حکومت کرنے والے تمام کے تمام مسلمان "غیر ملکی تھے" ان کا تعلق ہندوستان سے نہیں تھا۔ وہ سب باہر سے آئے تھے۔ برصغیر کے دو مغل شہنشاہ ایسے تھے جن کی مائیں ہندو تھیں۔ مغلوں سے پہلے اس قسم کی مثال شاید ہی کوئی ہو۔ مسلمانوں میں نسلی تعصب تو نہیں تھا مگر برصغیر میں آنے کے بعد انہوں نے اپنے ہی گروہ میں شادیوں کا اہتمام کیا تھا۔ گو ترکی اور تازی میں کوئی فرق نہ تھا اور ایک کی دوسرے گروہ میں شادی پر کوئی پابندی نہ تھی۔ مگر آپس کی شادیوں نے گروہوں کی خصوصیات میں تبدیلی نہیں آنے دی۔ برصغیر کے مسلمانوں کی آبادی کے غالب عنصر کا تعلق وسط ایشیا سے رہا ہے کیونکہ دسویں صدی کے بعد حکمران عام طور پر ترک نژاد تھے۔

معلوم یوں ہوتا ہے کہ اسلام کے باقاعدہ پھیلاؤ کے لئے منصوبہ بندی نہیں کی گئی۔ کوئی ایسی تنظیم قائم نہیں کی گئی تبلیغ دین کا کام جس کو سونپا گیا ہو۔ یورپی سامراج کے ساتھ آنے والے مشنری منظم تھے۔ انہیں تبلیغ کے لئے ہر قسم کی سہولتیں فراہم کی جاتی تھیں۔ صرف مغرب سے آکر مختلف علاقوں پر قابض ہو جانے والے حکمران ہی ان کی اعانت نہیں کرتے تھے۔ انہیں آبائی وطن کے حکام اور دوسرے بہت سے اداروں سے مدد ملتی رہتی تھی۔ مسلمان مبلغوں کے لئے تبلیغ معاونتی اقدام تھا۔ اولیں ترجیح نہیں تھی۔ صوفیائے کرام نے بھی یوں لگتا ہے اسے خاص اہمیت نہیں دی۔ کیشنانہ جدوجہد چند "سلسلوں" کا نصب العین ضرور تھا مگر اس کے باوجود ان کی توجہ اپنے روحانی ڈسپلن اور مسلمانوں میں دین سے عقیدت پیدا کرنے تک محدود رہی۔

اسلام جنوبی ہند میں اکثریت کا مذہب تبدیل کرنے میں تو ناکام رہا مگر اس کی آمد سے ہندومت کے بہت سے عقائد میں تبدیلی کے آثار رونما ہوئے۔ ہندومت کی اساس تو وہی رہی۔ طبقاتی نظام تو قائم رہا اور شودروں سے نفرت تو ختم نہ ہو سکی مگر دوسرے

عقیدے اسلام سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ برصغیر میں ترکوں کے ورود کے بعد مسلمان ترک کہلانے لگے۔ عربستان میں ایک عیسائی عرب مسلمان ہو جانے کے بعد بھی عرب ہی رہا مگر ہندوستان میں ہندو اسلام قبول کر لینے کے بعد ہندوستانی نہیں رہا۔ اسے غیر ملکی معاشرے کا فرد قرار دیا جانے لگا۔ اور تبدیلی مذہب نے اسے اپنے وطن سے بھی الگ کر دیا۔

سندھ میں تبلیغی جدوجہد بہاء الدین ذکریا کی وساطت سے شروع ہوئی۔ اس وقت سندھ کا حکمران طبقہ اسماعیلیوں کے زیر اثر تھا۔ اسماعیلیوں اور سنیوں میں چپقلش کا آغاز تو بغداد میں عباسی خلافت اور مصر میں فاطمی اقتدار کے قیام کے فوراً ہی بعد ہو گیا تھا۔ اور سندھ میں راسخ الاعتقادی پسپا ہو رہی تھی۔ تاریخ سے یہ معلوم نہیں ہوتا ہے کہ سندھ کی اسماعیلی حکومتیں سنیوں کے خلاف کس انداز سے کارروائی میں مصروف تھیں۔ کام جبر اور استبداد سے لیا جا رہا تھا یا دباؤ کسی اور قسم کا تھا۔ سیاست میں ان دنوں جبر کا سہارا حالات کا تقاضا تھا کیونکہ یہ محض دو مکاتیب فکر کے درمیان کشمکش ہی نہیں تھی اس کے سیاسی مضمرات بھی تھے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ سنی تبلیغ اور تشہیر کا کام پس پردہ جاری تھا اور گجرات اور پنجاب پر سنی حکومتوں کے قیام سے سندھ کی سنی تحریک کو مدد مل رہی تھی۔ سومرو خاندان اور سما خاندان کی حکومتوں کو خاموش انقلاب نے آلیا۔ اور اسماعیلیوں نے بالآخر پسپائی اختیار کر لی۔

سندھ کے خاموش انقلاب کا کریڈٹ حضرت بہاء الدین ذکریا کو جاتا ہے۔ جو ملتان کے قریب پیدا ہوئے اوائل عمری میں خراسان منتقل ہو گئے۔ جہاں انہوں نے تعلیم حاصل کی۔ تعلیم کی تکمیل کے بعد حجاز میں مقدس مقامات کی زیارت کے بعد وہ بغداد جا پہنچے جہاں ان کی شہرۂ آفاق صوفی شہاب الدین سہروردی سے ملاقات ہوئی۔ اور وہ سہروردیہ برادری میں شامل ہو گئے۔ ان کے اتالیق نے انہیں ملتان جانے کا حکم دیا۔ انہوں نے ملتان پہنچ کر تبلیغ کے کام کا آغاز کیا اور جناب بہاء الدین ذکریا نے اسماعیلیوں کو پھر سے سنی عقائد کی طرف مائل کر لیا انہیں ہندوؤں میں خاص کامیابی حاصل ہوئی اور انہوں نے اپنی تبلیغ کا دائرہ سندھ تک پھیلا دیا۔ سندھ سے لاتعداد افراد ان کے ہاتھوں پر بیعت کرنے کے لئے ملتان آئے۔ ان شواہد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سندھ میں تبلیغ کا

کام ہو رہا تھا۔ اور صوفیاء جو اس امر میں دلچسپی لے رہے تھے جناب بہاؤ الدین ذکریاؒ سے ہدایات حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔ سندھ میں سنی مسلمانوں کو کب اکثریت حاصل ہوئی اس کے متعلق تو وثوق سے کچھ کہا نہیں جا سکتا۔ بمبئی پریذیڈنسی کے گزیٹر میں کیپٹن الیگزینڈر ہملٹن کے حوالے سے یہ کہا گیا ہے کہ 1699ء میں ٹھٹھ میں ہندوؤں کی تعداد مسلمانوں سے دس گنا زیادہ تھی۔ ایک ٹھٹھ شہر کی آبادی کے اندازے سے اور وہ اندازہ بھی ایک غیر ملکی سیاح کا ہے سارے سندھ کی آبادی کے متعلق تخمینہ لگانا نامناسب ہے۔ ہندو زیادہ تر شہروں میں آباد تھے مگر سندھ میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔

ملتان اور اچ تو تبلیغی جدوجہد کے مراکز رہے مگر غزنویوں کے اقتدار سنبھالنے کے بعد لاہور اسلام کا ثقافتی مرکز بن گیا۔ کہتے ہیں کہ شیخ اسماعیل نامی ایک بزرگ غزنوی اقتدار کے استحکام سے کچھ پہلے لاہور چلے آئے تھے۔ اور ان کی وساطت سے ہزاروں نے اسلام قبول کیا۔ داتا گنج بخش نے بھی اس ضمن میں بہت کچھ کیا۔ کشمیر میں بھی اسلام صوفیاء ہی کی وساطت سے پہنچا۔ سہروردیہ سلسلے کے ایک بزرگ جن کا نام شرف الدین تھا اور جو بعد کو بلبل شاہ کے نام سے مشہور ہوئے چودھویں صدی عیسوی کے اوائل میں وہاں پہنچے۔ اس وقت کشمیر کا حکمران رنجن دیو تھا۔ رنجن دیو نے اسلام قبول کر لیا۔ اس کی وفات کے بعد وادی میں اسلام قبول کرنے والوں اور اس تبدیلی مذہب کے مخالفین کے درمیان جھڑپیں ہوتی رہیں مگر امیر کبیر سید علی ہمدانی کے ورود پر حالات تبدیل ہو گئے۔ سات سو کے قریب سید زادے ان کے ہمراہ کشمیر آئے جنہوں نے اپنے آپ کو اسلام کی تبلیغ کے لئے وقف کر دیا۔ اور یوں ہزاروں افراد حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اسلام کو پاکستان اور اس کے ملحقہ علاقوں میں استحکام حاصل ہو گیا۔ ان علاقوں میں رہائش پذیر لوگوں کی غالب اکثریت نے اسلام قبول کر لیا۔

اسلام دوسرے علاقوں میں بھی پھیلتا چلا گیا۔ مسلمان مورخوں کے مطابق ان علاقوں میں آباد ہونے والے مسلمانوں سے اتنا برا سلوک نہیں کیا گیا۔ یہ نہیں کہ انہیں مکمل سکون سے زندگی بسر کرنے کی اجازت دی گئی۔ ان کے خلاف عصبیت کا ہتھیار بہت سی جگہوں پر استعمال کیا گیا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ بعض مقامات پر پارسیوں نے ہندوؤں کو مسلمانوں کے خلاف اکسایا۔ ایک جگہ ہندوؤں نے مسجد کا ایک مینار مسمار کر کے آٹھ

مسلمانوں کو شہید کر دیا۔ علاقے کے ہندو حاکم کے پاس شکایت پہنچی تو اس نے تحقیقات کرنے کے بعد مسلمانوں کو مسجد کی مرمت کے لئے رقم بھی فراہم کی اور اس جرم میں ملوث افراد کو سزا بھی دی۔ مسلمان تاجروں کی نو آبادیوں کا تحفظ حاکموں کے مفاد میں تھا۔ ان کی مدد اس لئے نہیں کی گئی کہ وہ مسلمان تھے اور مقامی باشندوں نے ان پر تشدد کیا تھا۔ ان کی اعانت حکومت کی ضرورت تھی۔ وہ تاجر تھے۔ باہر سے چیزیں لانے والے اور چیزیں باہر لے جانے والے تھے ان کی موجودگی ریاست کے لئے سود مند تھی۔ ریاست ان سے مالی فوائد حاصل کرتی تھی۔

اسلام نے اتساع کے لئے نہ جبر کا استعمال کیا نہ تلوار کا۔ ہندو مصنفین کو چند مثالیں ایسی ضرور مل گئی ہوں گی جہاں مذہب تبدیل کر کے اسلام قبول کرنے والوں سے امتیازی سلوک کیا گیا۔ پروفیسر سری رام شرما نے اپنی تصنیف "مغل شاہنشاہوں کی مذہبی پالیسی" میں مذہب تبدیل کرنے والے بعض ہندوؤں کے نام دیئے ہیں اور ان مراعات کا تذکرہ بھی کیا ہے جو مذہب کی تبدیلی پر انہیں عطا کی گئیں۔ ایک ہری رام بھگت کے متعلق جس نے دسمبر 1666ء میں اسلام قبول کیا کہا گیا ہے کہ اسے چار آنے روزانہ الاؤنس دیا جانے لگا۔ بعض دوسرے لوگوں کو خلعتیں عطا کی گئیں۔ مگر ان کی طرف سے 1666ء سے لے کر 1731ء تک مذہب تبدیل کرنے والوں کی فہرست مختصر سی ہے۔ یہ سچ ہے کہ ہر کسی کا نام تو مورخین تک نہیں پہنچا ہو گا اور سو سال کے طویل عرصے میں دس بیس ہی نے مذہب تبدیل نہیں کیا ہو گا۔ عین ممکن ہے کہ یہ تعداد اس سے کہیں زیادہ ہو۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ جبر اور تشدد سے مذہب تبدیل کرانے کا الزام محض اختراع ہے۔ اس کا سچائی سے دور کا تعلق بھی نہیں۔ بلکہ بعض مسلمانوں کا تو یہ خیال ہے کہ ہندوستان کے مسلمان حاکموں نے مذہب کی تبلیغ کے لئے سنجیدگی سے کوئی کام نہیں کیا۔ اگر وہ اس امر میں دلچسپی لیتے تو مسلمان برصغیر میں ہندوؤں کے ایک چوتھائی کے برابر ہوتے۔

سلہٹ میں برہان الدین نامی ایک شخص نے اپنے بیٹے کی پیدائش پر گائے کی قربانی دی تو وہاں کے برہمنوں نے برا مانا۔ ایک ہندو راجہ کے پاس شکایت کی گئی۔ راجہ نے نوزائیدہ بچے کو قتل کرنے اور باپ کے ہاتھ کاٹنے کا حکم دے دیا۔ برہان الدین نکل بھاگا

اور بنگال کے ان دنوں کے دارالحکومت جا پہنچا۔ راجہ کے خلاف تادیبی کارروائی کا فیصلہ کیا گیا۔ فوج بھیجی گئی۔ اس مہم میں شیخ جلال بجرو بھی شریک تھے۔ مسلمان سپاہی آسام کے باشندوں کے جادو سے خوفزدہ ضرور تھے مگر شیخ بجرو کی موجودگی نے ان کے حوصلے بلند کئے۔ راجہ کو شکست ہوئی اور سلہٹ بنگال کی سلطنت میں شامل کر لیا گیا۔ شیخ جلال بجرو کا مزار سلہٹ میں ہے اور ان کے عقیدت مند ہزاروں کی تعداد میں نذر گذارنے کے لئے مزار پر حاضری دیتے ہیں۔ شیخ جلال کا تعلق سلسلہ سہروردیہ سے تھا۔ ایک اور بزرگ ابراہیمؒ دانشمند جن کا مزار ڈھاکہ سے کچھ دور سنار گاؤں میں مرجع خلائق ہے بھی بنگال میں اسلام کی تبلیغ کے لئے بھیجے گئے۔ وہ بھی بیرون ملک سے حضرت بہاء الدین ذکریاؒ کے پاس آئے تھے اور ان کے کہنے پر پہلے سرحد میں کانی گرام گئے۔ وہاں سے وہ بنگال کیسے اور کیونکر پہنچے اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں ہو سکا۔

اس میں کلام نہیں کہ برصغیر میں اسلام مسلمان حکمرانوں نے نہیں پھیلایا۔ ان صوفیائے کرام کی وساطت سے مقبول ہوا جو ان حکمرانوں کے ساتھ باہر سے آئے تھے۔ غیر جانبدار مغربی مصنفین نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے کہ اسلام کے اتساع کا تعلق تلوار سے نہیں ان بزرگوں کے کردار سے ہے۔ جنہوں نے اس کی تبلیغ کی۔ یہ بجا ہے کہ دہلی کے مسلمان حکمرانوں کا تعلق برصغیر سے نہیں تھا۔ ان خاندانوں کے لہو میں مقامی خون کی آمیزش ضرور ہوئی۔ مگر غیر ملکی عنصر کو ختم نہیں کیا گیا۔ مغل شاہنشاہوں میں سے دو کی مائیں ہندو ضرور تھیں۔ مغلوں سے پہلے اس قسم کی مثالیں شاذ و نادر ہی نظر آتی ہیں۔ ہندو چونکہ اہل کتاب نہیں تھے اس لئے ان سے شادی اسی وقت ممکن تھی جب ہندو خواتین اسلام قبول کر لیتیں۔ اس لئے ہندو عورتوں سے عام طور پر شادی نہیں کی گئی۔ اور مسلمانوں کی شادیاں اپنے ہی گروہ میں ہوتی رہیں۔ مسلمانوں کے ہاں رنگ و نسل کی تمیز تو تھی نہیں۔ اس لئے آپس کی شادیوں پر کوئی قدغن نہ تھی۔ برصغیر کی مسلم آبادی میں غیر ملکی عنصر کا تعلق زیادہ تر وسط ایشیا سے ہے کیونکہ دسویں صدی عیسوی کے بعد مسلمان فاتح عام طور پر ترک نژاد تھے۔ یہ کہہ دینا کہ برصغیر میں آباد تمام مسلمان پہلے ہندو تھے اور اسلام قبول کرنے کے بعد مسلمان کہلانے لگے کچھ ایسا درست معلوم نہیں ہوتا۔ اسے جزوی طور پر صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ برصغیر دو علیحدہ "

نسلیں" (اسے قومیں بھی کہا جا سکتا ہے) آباد تھیں ایک وہ جو ہندو کہلاتے تھے اور دوسرے وہ جو مسلمان تھے۔ ہندو مذہب بدل لینے والے اپنے ساتھیوں کو بھی "ترک" ہی کہتے تھے۔ انہیں الگ قوم کا رکن قرار دے دیا جاتا تھا۔ اور برصغیر سے ان کا تعلق سلب کر لیا جاتا تھا۔

—— مسلمان برصغیر میں ایک جگہ آباد نہیں ہوئے۔ وہ مختلف اطراف میں پھیلے ہوئے تھے۔ بیرون ملک سے آنے والوں کی زبان بھی ایک نہیں تھی۔ ان کا کلچر بھی ایک سا نہیں تھا۔ ہندوستان کے وہ رہنے والے جنہوں نے مذہب تبدیل کیا تھا ان میں صرف ایک چیز مشترک تھی اور وہ تھی برصغیر کی مٹی سے ان کا دیرینہ تعلق۔ ان میں سے بھی کچھ بنگالی تھے۔ کچھ پنجابی۔ کچھ سندھی اور کچھ وہ جن کا تعلق جنوب سے تھا۔ ان کی زبانیں بھی مختلف تھیں۔ ان کا کلچر بھی ایک سا نہیں تھا۔ عرب' ترک' افغان' ایرانی اور مقامی مسلمان ان میں یکجہتی کا جذبہ کیونکر پیدا ہو سکتا تھا۔ مزید برآں باہر سے آنے والوں کا تعلق مختلف مکاتیب فکر سے تھا۔ کچھ ایسے فرقے بھی تھے جو ایک دوسرے کے قریب آنے سے گریز کرتے تھے۔ اس کے باوجود برصغیر میں آباد مسلمانوں میں یکجہتی تھی۔

اس کی سب سے اہم وجہ تو ان کا مذہب تھا' اسلام ایک ایسا مذہب ہے جو ملت کی تخلیق کا قائل ہے۔ اس کے پاس اپنے شعائر ہیں اپنی اہمیت ہے۔ اسے اجتماعی فرائض کی انجام دہی کے لئے جماعتی تنظیم کی ضرورت ہے۔ یکجہتی کا اسلام کا اپنا ایک تصور ہے۔ قوم رسول ہاشمی کی ترکیب اقبالؒ کے کہنے کے مطابق خاص ہے۔ اسے وہی سمجھ سکتا ہے جو مسلمان ہو۔ غیر مسلم اس تصور کو سمجھنے سے قاصر ہیں۔ انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوتا ہے کہ پاکستان کا مسلمان فلسطین کے مسلمان کا ہمدرد ہے۔ کلیت پسندی اور عمومیت' اسلام کے بنیادی اصول ہیں۔ یہ اصول دین اور مذہب کی تائید کرتے ہوئے اختلافات کو کم کرتے ہیں۔ یوں تو برصغیر کے ہندو بھی مختلف لسانی اور نسلی گروہوں سے متعلق ہیں۔ اس کے باوجود ہندو مت کا بنیادی فلسفہ اور ان کا مخصوص طرز زندگی ان میں ایک مجانست پیدا کرتا ہے۔ یوں برصغیر کے ہندو اپنے لسانی اور نسلی تضادات کے باوجود ایک قوم کہلانے کے حقدار ہیں۔ یہ خصوصیات مسلمانوں نے اپنی جائے رہائش سے مستعار لے لیں۔ یوں ان میں بھی ایک مجانست قائم ہو گئی۔

عرب اسلام قبول کرنے کے بعد بھی عرب کہلائے۔ ترک مسلمان ہو جانے کے بعد بھی ترک کہلاتے ہیں۔ ایرانی قبل از اسلام کی تہذیب پر نازاں رہے۔ یہ شرف صرف برصغیر کے مسلمانوں کو حاصل ہے جہاں مسلمانوں کے درمیان ترکی اور تازی کا فرق باقی نہیں رہا۔ عرب' ترک' افغان' ایرانی سب کے سب اپنے نسلی اور لسانی اختلافات کے باوجود برصغیر میں آباد ہو کر محض مسلمان کہلائے۔ مسلمان آباد کاروں کی آبادیاں غیر مسلموں کے نرغے میں تھیں۔ عدم تحفظ کا احساس جو مغل دور میں باقی نہیں رہا انہیں ایک دوسرے کے قریب آنے اور اپنے اختلافات کو فراموش کر دینے پر مجبور کرتا رہا۔ جب مسلمانوں نے ہندو مرہٹوں کے تسلط کا خطرہ محسوس کیا تو افغانستان سے احمد شاہ ابدالی کو مدد کے لئے پکارا۔ نسلی اعتبار سے منگول ترکوں کے قریب تھے۔ مگر ترکوں کی طرف سے ان کی یلغار کی مزاحمت اس لئے کی گئی کہ وہ مسلمان نہیں تھے۔ یہ منگولوں اور ترکوں کی آویزش نہیں تھی۔ نہ ہی مقابلہ ہندوستانیوں اور منگولوں کے درمیان تھا۔ یہ لڑائی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے درمیان تھی۔ یہ معرکہ اسلام اور کفر کا تھا۔

——— منگولوں کے بعد برصغیر پر دوسرا دباؤ انگریزوں کا تھا۔ یہ دباؤ ہندوؤں اور مسلمانوں میں اتحاد پیدا کرنے میں ناکام رہا۔

انگریزوں کے متعلق مسلمانوں کا رویہ ہندوؤں کے رویئے سے مختلف تھا۔ مسلمان اپنے ماضی سے الگ ہونے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کی حکومت کے چھن جانے سے ان میں عدم تحفظ کا احساس مزید اجاگر ضرور ہوا۔ مگر وہ انگریز سے اقتدار چھین لینے کے خواب ضرور دیکھتے رہے۔ یہ خواب فرد واحد کا خواب نہیں تھا۔ ملت کے تمام افراد یہ خواب دیکھ رہے تھے۔ وسط ایشیا میں منگولوں کی یلغار نے بے شمار مسلمانوں کو برصغیر میں پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ برصغیر کی مسلمان حکومتیں باہر سے آ کر برصغیر میں آباد ہونے والے مسلمانوں کو خوش آمدید کہتی تھیں۔ یہ کہہ دینا بھی غلط نہ ہو گا کہ برصغیر کے حالات کے پیش نظر مسلمانوں کی محدود آبادی کو دیکھتے ہوئے مسلمان حکمران بیرون ملک آباد مسلمانوں کو نقل مکانی کر کے برصغیر میں آباد ہونے کی حوصلہ افزائی کرتے تھے۔ اس کے لئے حکومتوں کے پاس ایک خاص محکمہ کام کر رہا تھا جس کا کام برصغیر میں آ کر آباد ہونے والے مسلمانوں کی نگہداشت تھا۔ یہ محکمہ ان کی رہائش کے مناسب انتظام بھی کرتا تھا

اور ان کے لئے روزگار کے وسائل پیدا کرنے کی ذمہ داری بھی اسی کی تھی۔

حکومتوں اور حکمرانوں کی تبدیلی انہی کے لئے وجہ مخاصمت تھی جن سے حکومتیں چھینی جاتی تھیں۔ عام مسلمان ایک خاندان کی حکومت کے اختتام پر دوسرے حاکم سے اس وقت تک مطمئن رہتے تھے جب تک انہیں ظلم و تشدد کا ہدف نہیں بنایا جاتا تھا۔ مغلوں سے عداوت افغانوں کی تھی کیونکہ مغلوں نے ہندوستان کی حکومت انہی سے چھینی تھی۔ دوسرے مسلمان اس چپقلش میں عام طور پر غیر جانبدار تھے۔ پیر روشان ایک مدت تک مغلوں کے خلاف نبرد آزما رہا۔ شاہجہاں کے دور میں اس کے جانشینوں نے مغل حاکموں سے مراعات حاصل کرنے کے بعد بغاوت سے علیحدگی اختیار کر لی۔ خوشحال خان خٹک نے بھی مغلوں خاص طور پر اورنگ زیب کے خلاف علم بغاوت بلند کیا۔ مکمل کامیابی اسے بھی حاصل نہ ہوئی۔

مغربی مصنفین وسط ایشیا کے متعلق اس حیرت کا اظہار ضرور کرتے ہیں کہ اس علاقے میں ترکوں' ازبکوں اور تاجکوں کی موجودگی کے باوجود وہاں کے عوام نے تاجک' ازبک اور ترک قومیت کا نعرہ بلند نہیں کیا۔ ایک قوم کی طرح ایک مدت تک وسط ایشیا میں آباد رہے۔ روسی کیمونسٹوں کی آمد پر انہیں مختلف قومیتوں میں تقسیم کر دیا گیا۔ اور یہ تقسیم جس نے بھی کی اب مستقل صورت اختیار کر چکی ہے۔ ان کی حیرت کی وجہ ان کی اسلام کی روح سے ناآشنائی ہے۔ کیونکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ رسول ہاشمیؐ کی امت اپنی ترکیب میں دنیا کی تمام اقوام سے الگ ہے ———

برصغیر کے مسلمانوں کو بیرونی حملوں کا اس قدر خوف نہ تھا۔ انہیں خطرہ تھا تو برصغیر میں آباد ہندو قوم کی اکثریت سے اور اسی عدم تحفظ کے احساس نے جس کا تعلق اندرون ملک کے حالات سے تھا انہیں ایک دوسرے کے قریب تر لانے میں اہم کردار ادا کیا منگولوں کی برصغیر میں مداخلت نے ان کے عدم تحفظ کے احساسات کو تقویت دی تھی۔ اور انگریزی اقتدار کے پھیلنے سے شدید ہو گیا تھا۔ انہوں نے اقتدار کے پھر سے حصول کے امکانات کو یکسر مسترد تو نہیں کیا تھا انہوں نے اس خطرے سے نمٹنے کے لئے جو ان کے علیحدہ تشخص پر ضرب لگا رہا تھا دیگر ذرائع سے کام لینے کی مساعی بھی کی تھیں ——— ہندو اور مسلم کلچر کا تفاوت برقرار رہا۔ مسلمانوں کے کلچر کے غالب عنصر اسلامی

رہے۔ اس میں وہ اثرات ضرور موجود تھے جو انھیں ان ممالک سے حاصل ہوئے تھے برصغیر میں آباد ہونے سے قبل مسلمانوں کا جن سے تعلق تھا۔ ان کے برصغیر میں آباد ہو جانے کے بعد ان کا اپنی دیرینہ قومیتوں سے تعلق نہیں رہا۔ نہ وہ عرب رہے نہ ایرانی۔ نہ ترک نہ افغان۔ انھوں نے ایک مخصوص طبقاتی حیثیت حاصل کر لی۔ ان کا کلچر ان کا اپنا رہا۔ اس پر "ہندوستانیت" کے عمل سے آثار ضرور نمودار ہوئے۔ مگر ہندوستانی کلچر اسے اپنے اندر مکمل طور پر جذب کرنے میں ناکام رہا۔ ایک موسیقی پر اس کے کچھ اثرات مرتب ضرور ہوئے ان علاقوں میں جہاں اس ضمن میں اسلامی اقدار کمزور تھیں ہندوستانی موسیقی کامیاب رہی۔ مگر اسے بھی تغیر اور تبدیلی کے ساتھ تسلیم کیا گیا۔ اسے من و عن قبول نہیں کیا گیا۔ اس میں "اسلامیت" کو ضرور شامل کر لیا گیا۔

شہروں میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے اختلاط میں خاطر خواہ اتفاق ہوا۔ ہندو سرداروں نے البتہ مسلمانوں کو دل سے قبول نہیں کیا۔ مسلمانوں نے ان سے ان کی حکومتیں چھین لی تھیں۔ ان میں سے بہت سوں نے مسلمان حکمرانوں سے تعاون کیا اور اس تعاون کا انہیں صلہ بھی دیا گیا۔ کچھ ایسے بھی تھے جنھوں نے اپنی شکست کو فراموش نہیں کیا تھا۔ وہ مسلمانوں سے تعاون کے لئے تیار نہیں تھے اور وہ ہندو اقتدار اور ہندو عظمت کی بحالی کے لئے کوشاں تھے۔ ان کا یہ کردار انھیں ہندوؤں میں ہردلعزیز بنا دیتا تھا۔ مسلمان حکمران مسلمانوں اور مقامی لوگوں کی تفریق کو دور کرنے کی ہر ممکن کوشش کرتے تھے۔ انھیں یہ معلوم تھا کہ دونوں کے درمیان مذہب اور کلچر کی خلیج حائل ہے۔ وہ ایسے اقدامات ضرور اٹھاتے رہے جن سے دونوں کے درمیان یہ فاصلے کسی صورت ختم ہو جائیں۔ اور حکمرانوں کی ان مساعی میں صوفیائے کرام کا تعاون بھی شامل تھا۔ ——

مسلم فن تعمیر (جو بنیادی طور پر وسط ایشیائی تھا) اور ہندو فن تعمیر میں ان عمارات کی تشکیل اور تخلیق کے سلسلے میں جن کا تعلق براہ راست مذہب سے نہیں معمولی آمیزش ضرور نظر آتی ہے۔ مگر مسجد اور مندر کی تعمیر کا پلان ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ مندر میں گنبد اور مینار موجود نہیں اور مندر کی ساخت کچھ اس قسم کی ہے کہ مصنوعی روشنی کے بغیر اس میں عبادت آسان نہیں۔ مسجد ایک کشادہ عبادت گاہ ہے جس میں روشنی کے لئے مصنوعی طریقے صرف اسی وقت استعمال کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے جب

سورج غروب ہو جائے۔

مسلمانوں نے برصغیر کو اپنی مستقل رہائش کے لئے منتخب کیا۔ وہ اپنے وطن چھوڑ کر یہاں آئے۔ اور یہیں کے ہو کے رہ گئے۔ عرب، ترک، افغان، ایرانی سب کے سب یہاں آئے۔ یہاں آ کر وہ نہ عرب رہے۔ نہ ترک، ترکی و تازی کے سارے تفاوت ختم کر دیئے گئے۔ وہ مسلمان بھی رہے اور ان کا تعلق ہندوستان سے بھی قائم رہا۔ انگریزوں کی آمد کے بعد انھیں اپنے تشخص کے استحکام کا خیال آیا۔ انھوں نے اس تشخص کو مستحکم کیا۔ انھیں معلوم تھا کہ وہ ایک علیحدہ قوم ہیں۔ ہندوستان میں آباد ضرور ہیں اور اس کے لئے سب کچھ کرنے کو تیار ہیں۔ مگر اپنے آپ کو اکثریت میں مدغم کرنے کے لئے تیار نہیں۔

تشخص کی تلاش ——— پس منظر

دو قومی نظریہ اور تحریک پاکستان

نہ افغانیم و نے ترک و تتاریم   چمن زادیم و از یک شاخساریم
تمیز رنگ و بو برما حرام است   کہ ما پروردۂ یک نو بہاریم

یہ ایک ناقابل تردید حقیقت ہے کہ مسلمانوں کے برصغیر میں آباد ہونے کے باوجود انہیں قبول نہیں کیا گیا۔ ان کی حکومت کی مخالفت تو الگ رہی۔ یہ ایک سیاسی تقاضا تھا۔ عام مسلمانوں کو بھی راندۂ درگاہ سمجھ کر ان سے بہت ہی برا سلوک کیا گیا۔ اقتدار، مسلمان حکمرانوں کے ہاتھ میں ہوتے ہوئے بھی ان کی مسلمان رعایا کو ہندو اس قدر پریشان کرتے تھے کہ ان کا سکون کے ساتھ جینا دو بھر ہو رہا تھا۔

مسلمانوں کے خلاف نفرت تو پہلے سے موجود تھی ان پر تشدد ہوتا ہی رہتا تھا۔ مگر باقاعدگی سے اس مہم کو تیمور کے حملے کے بعد منظم کیا گیا۔ تیمور تھا تو مسلمان مگر اس نے مسلمان حکومتوں اور مسلمان علاقوں کو غیر مسلموں سے زیادہ نقصان پہنچایا۔ دہلی سے رخصت ہونے کے بعد سید خضر خاں کو تیمور کا نائب مقرر کر دیا گیا۔ خضر خاں کے خاندان نے دہلی پر کوئی نصف صدی تک حکومت کی اور اس خاندان کے آخری تاجدار کے اقتدار کا دائرہ سمٹ کر دہلی سے پالم تک رہ گیا——وہ کہنے کو تو شاہ عالم کہلاتا تھا مگر اس کے متعلق یہ مشہور تھا۔

حکم خداوند عالم——از دہلی تا پالم

سید خاندان برائے نام حاکم تھا۔ ان کی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ہندوؤں نے جگہ جگہ اپنی آزاد ریاستیں قائم کر لیں۔ جنوب میں وجیا نگر ایک مضبوط ہندو ریاست کی حیثیت سے ہندوستان کے سیاسی افق پر نمودار ہوئی۔ اس کے حکمرانوں نے ہندو عظمت کی بحالی کے لئے اقدام کئے۔ اڑوس پڑوس کے ہندو دانشور، عالم اور مصلح مسلمان علاقوں سے نقل مکانی کر کے وجیا نگر میں جا آباد ہوئے۔ وجیا نگر میں رہائش پذیر مسلمانوں کو اس قدر ہراساں کیا گیا کہ ہزاروں ہجرت کر کے انڈونیشیا جا پہنچے۔ مرکز سے انہیں اعانت کی توقع نہ تھی۔ مرکز کے حکمران اپنے آپ کو محفوظ و مامون بنانے میں مصروف تھے۔ ہجرت

کے علاوہ ان مسلمانوں کے پاس چارۂ کار کوئی نہ تھا۔

سکندر لودھی کے عہد میں بہار میں شدھی کی تحریک شروع کر دی گئی۔ مسلمانوں کو زبردستی تبدیلیٔ مذہب پر مجبور کیا جانے لگا۔ جس نے ہندو بننے سے انکار کیا اسے بے دریغ قتل کر دیا گیا۔ فریاد سکندر لودھی تک پہنچائی گئی۔ مگر وہ اس قابل نہ تھا کہ دہلی سے جا کے بہار کے مسلمانوں کی مدد کرتا۔ کالپی کے مسلمان حاکم نے مذہب پر اقتدار کو ترجیح دیتے ہوئے اقتدار جانے کی خاطر ہندو مذہب قبول کرنا مناسب سمجھا اور اپنے آقاؤں کی خوشنودی کے لئے مسلمانوں پر اتنے مظالم ڈھائے کہ وہ چیخ اٹھے۔ بعض قصبوں اور شہروں میں شراب اور سور کا گوشت عام بکنے لگا۔ مسلمان خواتین کی بے حرمتی عام ہونے لگی۔ ان کے اغوا کی داستانیں مسلمان حکمرانوں کے کانوں تک پہنچیں مگر وہ کچھ بھی نہ کر سکے ——— راجستھان کے پرانے اسلامی مرکز ناگور پر حملہ کر کے اسے تباہ کر دیا گیا۔ رانا سانگا نے اجمیر شریف کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ شہر میں انسانوں کی جگہ درندے آکر آباد ہو گئے۔

اجمیر شریف کو مکمل طور پر تباہ کر دینے کے بعد رانا سانگا نے دہلی کو ہدف بنانے کی کوشش کی۔ وہ دہلی کو فتح کرنے کے بعد برصغیر میں ہندو ریاست قائم کرنے کا آرزو مند تھا۔ بابر نے 1526ء میں پانی پت کے مقام پر ابراہیم لودھی کو شکست دی تو رانا سانگا یہ سمجھا کہ بابر نے اس کا کام آسان کر دیا ہے۔ اس کا خیال تھا کہ بابر بھی لوٹ مار کے بعد دوسرے حملہ آوروں کی طرح واپس چلا جائے گا ——— بابر نے برصغیر میں مستقل قیام کا فیصلہ کیا تو رانا سانگا کو اس کی یہ جرات پسند نہیں آئی۔ تاریخ تو کہتی ہے کہ ابراہیم کی سرکوبی کے لئے اس نے بھی بابر کو کابل میں دعوت نامہ بھجوایا تھا مگر بابر کے برصغیر میں رہائش پذیر ہو جانے پر اپنی فوج لے کر بابر پر حملے کی غرض سے فتح پور سیکری جا پہنچا۔ بابر سے لڑائی ہوئی۔ رانا سانگا شکست کھا کے بھاگا۔ اس کا تعاقب کیا گیا۔ اور اسے اس جسارت پر جان سے ہاتھ دھونا پڑے۔

اور رانا سانگا کے بعد ہیموں بقال انہی ارادوں کو لے کر منظر پر نمودار ہوا۔ اس نے رانا سانگا کے نقش قدم پر چلتے ہوئے ہندو ریاست کے قیام کی غرض سے مسلمانوں کو تشدد کا نشانہ بنایا۔ اس نے اپنے وطن مالوف ریواڑی میں ایک کوے کی چونچ سے ایک

برہمن کے گھر ایک ہڈی گر جانے پر ایک درجن سے زائد مسلمان نہ تیغ کروا ڈالے اور یہ تمام کے تمام سید تھے۔ انہی کے عزیز و اقارب میں سے کسی نے لڑکے کی پیدائش پر دعوت کا اہتمام کیا تھا اور اس ہڈی کا تعلق اسی دعوت سے تھا۔ ہیموں بقال کو بیرم خاں نے شکست دی۔

مسلمانوں کے خلاف منظم تحریکوں کے سلسلے میں ایک نام جو شہرت حاصل کر چکا ہے اچے تینہ کا ہے۔ وہ رہنے والا تو بنگال کا تھا مگر اس نے مسلمانوں کو ہندو بنانے کی جدوجہد میں دور دراز کا سفر طے کیا۔ کرشن جی مہاراج کی جنم بھومی متھرا تک چلا آیا۔ دوران سفر مسلمانوں کو مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔ کچھ دینی فوائد کے حصول کے لئے، کچھ خوف کھا کر کچھ مستقبل سنوارنے کی غرض سے اسلام کو خیرباد کہہ گئے۔

اکبر نے حالات کو اور بگاڑ دیا۔ ہندوؤں کی تمام رسوم ایوان اقتدار پر قابض ہو گئیں۔ اگر اکبر کے اقدامات سے دونوں قومیں ایک ہو جاتیں تو بات الگ تھی مگر تاریخ کہتی ہے کہ اکبر کی حکمت عملی کو ہندوؤں نے اپنے مفاد کے حصول کے لئے استعمال کیا۔ مساجد کو کلبوں کے طور پر استعمال کیا جانے لگا۔ قبرستان مسمار کر دیئے گئے۔ بزرگوں کے مزار منہدم کر کے ان کی جگہ مندر تعمیر کئے گئے۔ حضرت مجدد الف ثانیؒ کی تحریروں سے بھی مسلمانوں کی بے بسی کا پتہ چلتا ہے۔ بعض مسلمان مورخین کا خیال ہے کہ اکبر کی وفات کے بعد دین داری مغل دربار میں واپس آگئی۔ مغل دربار کے راجپوت سردار شہزادہ خسرو کے حق میں تھے مگر اسلام پسندوں نے اس منصوبے کو ناکام بنا دیا۔ جہانگیر سے یہ وعدہ لیا گیا کہ وہ ان تمام اسلامی اداروں کو بحال کر دے گا اکبر نے جنہیں تاراج کر دیا تھا اور تخت کے لئے جہانگیر کی مدد کی گئی۔ حقیقت یہ ہے کہ اکبر کی وفات اور جہانگیر کی تخت نشینی پر راجپوت سردار اپنے قدم بڑی مضبوطی سے جما چکے تھے۔ سکھ مذہب بھی پروان چڑھ رہا تھا اور امرتسر اور ترن تارن میں گوردوارے تعمیر ہو چکے تھے۔ جہانگیر کے لئے ہر محاذ پر بے دینی کا مقابلہ کرنا آسان نہ تھا ——— شاہ جہاں کا عہد بھی کچھ ایسا ہی تھا ——— اکبر نے حالات کو اس قدر خراب کر دیا تھا کہ انہیں سنبھالنا آسان نہ تھا۔ سرہند شریف میں جہاں مجدد الف ثانی کی ابدی آرام گاہ تھی مسلمان عورتیں اغوا ہو رہی تھیں۔ لاہور سے کچھ پرے شمال میں گجرات شہر میں شاہجہاں کے عہد میں مسلمانوں کی

مساجد پر ہندوؤں کا قبضہ تھا۔ اور شاہجہاں کا ایک شہزادہ دارا شکوہ کو جسے سیکولر ذہن رکھنے والے درباری اورنگ زیب کی بجائے تاجور بنانا چاہتے تھے ہندو عقائد کے اس قدر قریب ہو گیا تھا کہ اسے عالم دین ہندو کہنے پر مجبور ہو گئے تھے۔

سکھوں نے مسلمانوں پر کم ظلم نہیں کئے۔ بندہ بیراگی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ وہ معصوم بچوں کو اچھال کر گرتے ہوئے انہیں تلوار کی نوک سے چھید ڈالنے کا قائل تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ اسے حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر کے مسرت سی محسوس ہوتی تھی —— اور سکھوں کے ہندو کارندے ان سے بھی دو قدم آگے تھے۔ مہاراجہ دلیپ سنگھ کے دور میں اس کے وزیر ہیرا سنگھ کا خصوصی مشیر جسے پنڈت جلا (یعنی پاگل) کہا جاتا تھا مسلمان رعایا پر ستم ڈھا کے تسکین حاصل کرتا تھا۔ اللہ سے خوف کھانے والے اس سے بھی خوف کھاتے تھے اور کہتے تھے —— اوپر اللہ تے تھلے جلا ——

—— اور پھر انگریز برصغیر میں وارد ہوئے۔

مشرقی تہذیب و ثقافت جب اپنے عروج پر تھی تو مغرب پر جہالت کی ظلمتوں کا راج تھا۔ مغرب میں تو بیداری کا اک ایسا دور آیا کہ اس کی کایا پلٹ گئی' احیاء العلوم کی ایک تحریک نے مغرب کو یوں جگمگا دیا کہ اس کی روشنی دور دور تک پھیل گئی۔ تو بیداری کی اس تحریک سے قبل کے ہزار سال مغرب سیاسی اور سماجی انتشار کا گہوارہ رہا۔ اس اثناء میں مسلمان چین کی سرحدات سے لے کر۔ سندھ کی وادی کو شامل کرتے ہوئے اطلانتک تک پھیلے ہوئے تھے۔ ہسپانیہ' جنوبی فرانس' سسلی اور جنوبی یورپ ان کے زیر نگیں تھے۔ عرب مسلمانوں نے قدیم دنیا کے علوم کو پھر سے زندگی ودیعت کی۔ انہوں نے یونانی فلسفہ اور سائنس کو اپنا لیا۔ فارسی کے کلاسیکی علوم اور ہندوؤں کی دانش سے استفادہ کیا۔

صلیبی جنگوں میں جب مغرب اور مسلمانوں کا تصادم ہوا تو مغرب نے مسلمانوں سے بہت کچھ سیکھا۔ پھر ہسپانیہ اور سسلی کے ذریعہ اسلامی دانش یورپ میں منتقل ہوتی چلی گئی۔ اہل یورپ تجسس کی راہ پر گامزن ہوئے۔ گھروں سے باہر نکلے۔ سمندروں کے سینے چیرتے ہوئے دور دور جا پہنچے۔ انہوں نے آغاز تجارت سے کیا۔ انہیں اپنے مال کی کھپت کے لئے منڈیوں کی ضرورت پڑی۔ پھر اسی مال کی تیاری کے لئے سستے خام مال کی

ضرورت محسوس ہوئی۔ وہ ہندوستان آ پہنچے۔ نئی جغرافیائی دریافتیں انہی کے تجسس کا نتیجہ ہیں۔ ایک پرتگیزی ملاح واسکوڈے گاما چار چھوٹے چھوٹے جہاز لے کر 1498ء میں سمندری سفر پر روانہ ہوا۔ وہ زنجبار کے شمال میں ملندی نامی ایک مقام پر پہنچا۔ اس خوشحال عرب قصبے کے عرب ملاحوں کی اعانت سے وہ راس امید سے ہوتے ہوئے برصغیر کے مغربی ساحل پر ایک بندرگاہ کالی کٹ جا پہنچا۔ کرسٹو فر کولمبس نکلا برصغیر کی تلاش میں۔ اس نے امریکہ دریافت کر لیا۔ اور اسی سال یعنی 1486ء میں بارتھل میوڈائز براعظم افریقہ کے آخری جنوبی کنارے تک جا پہنچا۔

پرتگال' ہالینڈ' انگلستان اور فرانس بڑی یورپی طاقتوں کی صورت میں دنیا کے نقشے پر نمودار ہوئے۔ پہلے پرتگیز برصغیر میں داخل ہوئے۔ الوارز کبرال نے سلطان بیجاپور کے علاقے گوا پر قبضہ کر لیا۔ اس کے ایک سال بعد یعنی 1511ء میں اس نے ملاکا کی بندرگاہ پر بھی اقتدار حاصل کر لیا۔ ان علاقوں کی تجارت پر عرب تاجر قابض تھے انہیں بیدخل کر دیا گیا۔ اس نے عدن پر قبضہ کرنے کی بھی کوشش کی۔ مگر یہ کوشش ناکام رہی۔ البوکرک نے گوا کی ساری مسلمان آبادی کو تہہ تیغ کر ڈالا۔ پرتگیز ساحلی علاقوں پر حملے کرتے رہے۔ ان علاقوں سے عورتیں اور بچے اٹھا اٹھا کر غلاموں کی منڈیوں میں فروخت کرتے رہے۔ انہوں نے لوگوں کو تلوار کی نوک پر مذہب تبدیل کرنے پر مجبور کیا۔ انہیں عیسائی بنایا۔ انکار کرنے والے پر اس قدر تشدد کیا گیا کہ وہ زندہ نہ رہ سکا۔ ان کے حوصلے اس قدر بلند ہو چکے تھے کہ وہ مغل شاہنشوں کو بھی خاطر میں نہ لاتے تھے۔ ایک بار انہوں نے مغلوں کی سرکاری کشتیوں کو بھی لوٹ لیا۔ ان میں سوار خواتین کو اغوا کر کے لے گئے۔ ان اغوا ہونے والی خواتین میں سے دو ممتاز محل کی خادمائیں بھی تھیں۔ گوا میں مارے جانے والے مسلمانوں پر حاکم خاموش رہے۔ ممتاز محل کی دو نوکرانیوں کے اغوا پر شاہجہاں کو طیش آ گیا۔ پرتگیزوں پر حملہ کر دیا گیا۔ پرتگیزوں نے لڑائی کے بغیر ہتھیار ڈالنا مناسب نہ سمجھا جنگ ہوئی۔ جنگ میں لاتعداد پرتگیز مارے گئے اور باقی جو بچے وہ تجارتی کوٹھی چھوڑ کر رخصت ہو گئے۔ اس واقعے کے بعد بنگال میں ان کا عمل دخل نہیں رہا۔ وہ گوا۔ دمن اور دیو تک محدود ہو کے رہ گئے۔ پرتگیزیوں کے انخلاء کے بعد انگریز اور فرانسیسی دو قوتیں میدان میں رہ گئیں۔ فرانسیسی بھی آہستہ آہستہ پسپا

ہوتے گئے۔ رہ گئے انگریز۔ انہوں نے پہلے بنگال اور پھر سارے برصغیر پر قبضہ کرلیا۔

—— پہلے بنگال میں مسلمانوں کے لئے عرصہ حیات تنگ کر دیا گیا۔ ان سے تمام حقوق چھین لئے گئے۔ انہیں زمینوں اور جاگیروں کی ملکیت کے ثبوت پیش کرنے کے لئے کہا گیا۔ وہ جو افرنگ کی تسلی نہ کر سکے ان سے ان کی جائیداد چھین لی گئی۔ انہیں سرکاری ملازمتوں سے علیحدہ کر دیا گیا۔ ان سے چھنی ہوئی مراعات ہندوؤں کو دے دی گئیں۔ مسلمانوں کے دینی اداروں کو دی ہوئی جائیداد واپس لے لی گئی۔ وہ جاگیریں مسلمان حکومتوں نے جن کا مالیہ معاف کر رکھا تھا مالکوں سے چھین لی گئیں۔ رات کو سونے والے مالکان صبح اٹھے تو بیدخل کر دیئے گئے۔ ان کے پاس ان کے بال بچوں کی کفالت کے لئے پھوٹی کوڑی نہ رہی۔ امیر راتوں رات غریب ہو گئے۔ غریبوں کی حالت اور بھی بگڑ گئی۔ ان کی مالی اعانت کرنے والا کوئی نہ رہا۔ ان کی حالت بد سے بدتر ہوتی چلی گئی۔ وہ اپنے ماضی کو بھولے تو نہیں تھے۔ اور انہوں نے ماضی سے تعلق استوار کرنے کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔

—— 1857ء میں افرنگ کے خلاف بغاوت ہو گئی۔ یہ نہیں کہا جا سکتا کہ بغاوت اچانک ہوئی۔ لاوا ایک مدت سے پک رہا تھا۔ اسے بہہ نکلنے کے لئے فوری وجوہ کی ضرورت تھی جو 1857ء میں دستیاب ہو گئیں۔ انگریزیوں تو برصغیر کے تمام باشندوں سے متنفر تھا مگر مسلمان خصوصی ہدف تھے۔ برصغیر کی حکومت انہوں نے مسلمانوں سے چھینی تھی اور وہ مسلمانوں کو ایسے مقام پر رکھنا چاہتے تھے جہاں سے ان کے پھر سے اٹھ کھڑے ہونے کا احتمال نہ رہے۔ انگریزوں کی طرف سے ظلم عام ہو رہے تھے۔ طریقے طریقے سے برصغیر کی ریاستیں فرنگی قلمرو میں شامل کی جا رہی تھیں۔ برصغیر کی دولت انگلستان منتقل کی جا رہی تھی۔ اور اس کے خلاف احتجاج کرنے والوں سے سختی کی جا رہی تھی۔ یہ نہیں کہ انگریز کے اقدامات سے صرف مسلمان ہی نالاں تھے۔ نالاں ہندو بھی تھے۔ مگر کم کم ان کی عداوت میں وہ شدت نہیں تھی جو مسلمانوں کے جذبات میں تھی۔ انگریز نے آ کے انہیں مسلمانوں سے نجات دلائی تھی۔ وہ اس حد تک تو انگریز کے ممنون تھے۔ مگر مسلمان تو پھر ایک طریق سے برصغیر سے متعلق تھے۔ انگریز تو خالص غیر ملکی تھا۔

—— ہندو قوم پرستی کا تعلق مذہب اور وطن سے تھا۔ اس میں مسلمانوں کے

لئے کوئی گنجائش نہیں تھی۔ انہوں نے اس قوم پرستی کے دائرے سے مسلمانوں کو خارج کر دیا تھا۔ وہ مسلمانوں کو بھی غیر ملکی ہی سمجھتے تھے۔ ان کی قوم پرستی کے اب دو حریف تھے۔ ایک مسلمان جنہیں اس سرزمین پر آباد ہوئے صدیاں گزر چکی تھیں اور دوسرے انگریز جو محض تجارت کی غرض سے آئے تھے اور بیٹھے بٹھائے اس ملک پر قابض ہو گئے۔ ان کے یہاں آنے سے مسلمانوں کا اقتدار تو دم توڑ گیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو حاصل مراعات مسلمانوں سے چھین کر ہندوؤں کو دے دیں۔ ان کی جگہ ملازمتیں عام طور پر ہندوؤں کو ملنے لگیں۔ ان کی تجارت بھی ہندوؤں کو منتقل ہو گئی۔ اس کے باوجود انگریز انگریز تھا۔ اس کا دیس بھی الگ تھا۔ اور مذہب بھی۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ ستاون کی بغاوت کا تعلق محض انگریز کی ہندوستانی افواج سے تھا۔ تاریخی شواہد سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ عام لوگ بھی اس میں شامل تھے۔ لوگوں میں چپاتیوں کی تقسیم سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ سازش کوئی سال بھر سے مرتب کی جا رہی تھی۔ چپاتیاں ایک گاؤں کے مکھیا سے دوسرے گاؤں کے مکھیا کی طرف بھیجی جا رہی تھیں۔ اور یہ سلسلہ اودھ کے انگریزی قلمرو میں شامل کئے جانے کے بعد شروع ہو گیا تھا۔ انگریزوں کو چپاتیوں کی نقل و حرکت کا علم تھا۔ مگر نہ معلوم کیوں انہیں چپاتیوں کی یہ تقسیم مشکوک نظر نہیں آئی۔ مزید برآں کسی نے ان کے مضمرات سے انگریز کو آگاہ بھی نہیں کیا۔ بعض انگریز مورخین کا کہنا ہے کہ چپاتیوں کی تقسیم مولوی احمد اللہ کا منصوبہ تھا جو انہوں نے شمال مغربی سرحدی صوبہ کے دورے کے دوران عوام کو بغاوت کے لئے تیار کرنے کے لئے تشکیل دیا تھا۔ یہ منصوبے کی امانت کا خاموش اقرار تھا اودھ کے الحاق کے بعد وہ آگرہ، دلی، پٹنہ، میرٹھ اور کلکتہ کے دورے پر گئے اور وہاں انہوں نے باغیانہ لٹریچر تقسیم کیا۔ انہیں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا اور انہیں موت کی سزا کا حکم ہوا۔ ابھی سزا پر عمل درآمد نہ ہونے پایا تھا کہ میرٹھ میں سپاہیوں نے بغاوت کر دی۔

اس میں کلام نہیں کہ بے چینی مسلمانوں میں زیادہ تھی۔ ہندو نسبتاً خاموش تھے۔ انگریزوں کی آمد سے قبل برصغیر میں مسلمانوں ہی کو امتیازی مقام حاصل تھا۔ یہ مقام ان سے چھین لیا گیا تھا۔ اور انہیں کس مپرسی کے قعر عمیق میں دھکیل دیا گیا تھا۔ انگریزوں سے مسلمانوں کو زیادہ شکایت تھی۔ اور انگریز ان پر اعتبار بھی نہیں کرتے تھے۔ مسلمان

زیدہ طبقے کے افراد کے لئے افواج کی ملازمت شجر ممنوعہ بنا دی گئی تھی۔ مسلمانوں کو فوج سے الگ رکھنا انگریز اپنے تحفظ کے لئے ضروری سمجھتے تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ مسلمان انہی کی فوج میں شامل ہو کر ہتھیار حاصل کر لینے کے بعد انہی پر چڑھ دوڑیں گے۔ مسلمانوں کی اقتصادی حالت ابتر تھی۔ ان کی جائیدادیں بغیر کسی معقول وجہ کے ضبط کر لی گئی تھیں۔ اور لارڈ ڈلہوزی کے اقدامات نے تو مسلمانوں کو اور بھی برہم کر دیا تھا۔ بہادر شاہ ظفر گو نام کا بادشاہ تھا مگر تھا مسلمانوں کی کھوئی ہوئی عظمت کی علامت۔ اس کا دربار اس کی بے بسی کے باوجود دہلی میں قائم تھا۔ دربار بہادر شاہ کے پیشروؤں کی شان و شوکت کا مظہر تو نہیں تھا۔ پھر بھی بادشاہ کا دربار تھا۔ اور برصغیر کے مسلمان یہ جانتے ہوئے بھی کہ زمام اقتدار درحقیقت انگریز کے ہاتھ میں ہے اس دربار کی موجودگی سے مطمئن سے معلوم ہوتے تھے۔ لارڈ ڈلہوزی نے یہ حکم دے رکھا تھا کہ یہ ظاہری شان و شوکت بہادر شاہ کی زندگی تک ہے۔ اس کی وفات کے بعد شاہی خاندان کو اپنے محل انگریزوں کے حوالے کر کے دربار ختم کر دینا ہو گا۔ بہادر شاہ ظفر کی وفات کے بعد آخری مغل تاجدار کی دہلی کے لال قلعے سے بیدخلی اور دہلی کے مضافات میں ہر دلی کے محل انگریزوں کے حوالے کر دینے کے استبدادی حکم نے مسلمانوں کے جذبات مجروح کر دیئے تھے۔ ڈلہوزی کا یہ حکم بھی تھا کہ بے اولاد مر جانے والے حاکموں کی ریاستیں انگریز سرکار کی ملکیت سمجھی جائیں گی۔ ڈلہوزی نے بے اولاد حکمرانوں کو متبنی نامزد کرنے کی اجازت دینے سے بھی انکار کر دیا تھا۔ اس طرح غیر مسلم حکمرانوں کو بھی مشکل حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے بعد ان کی ریاست انگریز کی تحویل میں لے لی جائے گی۔

برصغیر اور دنیا کے بعض دوسرے مقامات پر انگریزوں کی کامیابی نے ان کے ذہنوں میں یہ تصور تخلیق کر دیا تھا کہ وہ دنیا کی بہترین قوم ہیں۔ نسلی برتری کا احساس ان کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ ان کے دانشور۔ ادیب اور شاعر یہ اعلان کرنے لگے تھے کہ انہیں قدرت کی طرف سے دنیا پر حکومت کرنے کا حق ودیعت کیا گیا ہے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ انہوں نے یہ مقام انگریز قوم کی نیومندو اور پر زور ذہنی اور جسمانی توانائیوں کی وساطت سے حاصل کیا ہے ان میں سے ایک نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہم دنیا کی بہترین قوم ہیں۔ آزادی' نفاست' انصاف اور امن کے متعلق ہمارے تصورات مثالی ہیں

(یہ انگریز دانشور ہوؤس کے الفاظ کا مفہوم ہے)

ان کی استعمار پسندی کا یہ عالم تھا کہ افریقہ کے ایک سیاہ فام قبیلے کی موت ایک انگریز کی علالت سے بھی بہتر سمجھی جاتی تھی۔ چند ایک کے علاوہ مشرق کے متعلق لکھنے والے انگریزوں کی تحریروں میں اہل مشرق کی تضحیک ان کے کردار پر جا و بیجا تنقید۔ انہیں بددیانت۔ خائن' بدتمیز' جاہل' چور' ڈاکو قرار دینے سے ان کی اپنی نسلی برتری کے احساس کے اظہار کا اندازہ ہو جاتا ہے۔ انگریز عام ہندوستانیوں سے الگ تھلگ رہنے کے قائل تھے اور ہندوستانیوں سے ان کا سلوک حقارت آمیز تھا۔ وہ مقامی تہذیب کو بھی نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ اور میکالے کے کہنے کے مطابق انگریزی کی ایک کتاب مشرق کی تمام تصانیف سے بہتر اور برتر تھی۔ نسلی برتری کا احساس برصغیر کے رہنے والوں سے صرف اس لئے نفرت کہ وہ ان کے غلام تھے۔ اور ان کے علاوہ عیسائی مشنوں کی ریشہ دوانیاں انگریز فوجی افسران کی اعانت سے مقامی سپاہیوں کو تبدیلی مذہب پر اکسانے کی مساعی۔ بلکہ سپاہیوں کے مذاہب کے متعلق سپاہیوں کی موجودگی میں ملامت آمیز اور زجر سے نکلے ہوئے الفاظ کا بے دریغ استعمال ہندو بھی یہ محسوس کرنے لگے تھے کہ انہیں عیسائی بنانے کی سازش ہو رہی ہے —— مسلمانوں پر یہ جادو چونکہ کم کم اثر کرتا تھا اس لئے ان سے نفرت شدید تھی۔ اور پھر کمپنی بہادر کی طرف سے فوج کے استعمال کے لئے فراہم کئے جانے والے کارتوسوں کے متعلق یہ کہا جانے لگا کہ ان میں گائے اور سور کی چربی استعمال کی گئی ہے۔ سور مسلمانوں کے لئے حرام تھا اور گائے ہندوؤں کے لئے۔

حالات بگڑنے لگے۔ حادثات رونما ہونے لگے۔ ہندوستانی سپاہیوں کے کورٹ مارشل کی داستانیں سنی جانے لگیں۔ انہیں سخت سزائیں دی گئیں۔ بہت سوں کو دس دس سال کے لئے زندان میں پھینک دیا گیا۔ بہت سوں کو تختہ دار پر لٹکا دیا گیا۔ پہلے کلکتہ' بہرام پور اور بیرک پور میں بلوے ہوئے۔ پھر میرٹھ میں آگ بھڑک اٹھی۔ سپاہیوں کی ایک کمپنی نے نئے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کیا۔ انہیں گرفتار کر کے ان پر مقدمہ چلایا گیا اور سب کو دس سال کے لئے جیل بھیج دیا گیا۔ یہ جسارت 9 مئی 1857ء کو کی گئی۔ دوسرے ہی دن میرٹھ چھاؤنی کی تین رجمنٹوں نے بغاوت کر دی۔ اپنے قیدی ساتھیوں کو رہا کرنے کے بعد اپنے انگریز افسروں پر حملہ کر کے سب کو ہلاک کر دیا۔

اور دہلی کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ انہوں نے دہلی پر قبضہ کر لیا اور بہادر شاہ کو 11 مئی 1857ء کو پھر سے ہندوستان کا شاہنشاہ نامزد کر دیا گیا۔ بہادر شاہ کے فرزند مرزا افضل کو افواج کا سپہ سالار مقرر کر دیا گیا۔ بغاوت دوسری جگہوں پر بھی پھیل گئی۔ لڑائی ہوئی۔ انگریزوں نے ہندوستانیوں ہی کی مدد سے باقی ہندوستانیوں کو شکست دی۔

بغاوت تو فرو ہو گئی مگر ہندوستانی مسلمانوں کے خلاف نفرت کا ایک طوفان اٹھا اور ہندوستان کے بلند و پست پر پھیل گیا۔ انگریزوں کو یہ یقین تھا کہ ہندوستانیوں کو بغاوت پر اکسانے والے مسلمان ہیں۔ انگریز افسروں اور عورتوں اور بچوں کو انہی کے ایماء پر قتل کیا گیا۔ انگریز کا انتقام تمام توانائیاں ساتھ لے کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑا۔ ان کی عبادت گاہوں کی بے حرمتی کی گئی۔ مسلمان جہاں بھی ملا جسے بھی ملا قتل کر دیا گیا۔ انہیں سولی پر چڑھانے کے نئے طریقے ایجاد کئے گئے۔ انگریز سپاہیوں کو قتل و غارت کی کھلی چھٹی دے دی گئی۔ ان کا انتقام ہولناک تھا۔ بچہ' بوڑھا' مرد' عورت انہوں نے کسی مسلمان کو نہیں بخشا۔ جو سامنے آیا اسے قتل کر دیا۔ اناڑی شائق فن بھی حرکت میں آ گئے مسلمانوں کی نعشوں پر سور کی چربی مل کر انہیں سور کی کھالوں میں سی دیا گیا۔ اور پھر انہیں تحقیر کے لئے ہندوؤں کے حوالے کر دیا گیا۔ ہندو فارغ ہوئے تو سوروں کی کھالوں میں لپٹی ہوئی لاشیں نذر آتش کر دی گئیں مسلمانوں کو جیلوں میں بند کر دیا گیا۔ ان کی جائیدادیں ضبط کر لی گئیں۔ اناڑیوں نے انہیں درختوں سے لٹکا کر ہاتھیوں سے کھنچوایا۔ دہلی کو بڑے منظم طریقے سے لوٹا گیا۔ انگریز کے انتقام نے چنگیز' ہلاکو' اور تیمور کے ظلم و بربریت کو افسانہ بنا دیا۔

تختہ مشق صرف مسلمانوں ہی کو بنایا گیا۔ لارڈ ایلن برا نے ڈیوک آف و لنگٹن کو اپنے ایک خط میں لکھا۔ میں ان حقائق سے چشم پوشی نہیں کر سکتا کہ یہ قوم (مسلمان) بنیادی طور پر ہماری دشمن ہے۔ اور جبھی ہم ہندوؤں سے انتقام کی غرض سے ان سے گرم اختلاط کے ذریعہ روابط کو فروغ دے رہے ہیں۔ ہنٹر نے بغاوت کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا "مسلمان انگریزی اقتدار کے لئے مزمن خطرہ بن رہے ہیں۔"
1871ء میں اسی ڈبلیو۔ ڈبلیو ہنٹر (W. W. Hunter) نے مسلمانوں کے متعلق اظہار خیال کرتے ہوئے کہا —— انگریز حکومت مسلح غداروں سے گفت و شنید کی قائل نہیں۔

تلوار اٹھانے والوں کو تلوار ہی سے ان کے انجام تک پہنچایا جا سکتا ہے۔

—— 1857ء کی بغاوت کا ایک اہم نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ برصغیر میں کمپنی کا اقتدار ختم ہو گیا۔ اس کی جگہ برطانوی حکومت نے لے لی۔ یوں تو کمپنی کو اس سے پہلے بھی برطانوی حکومت کی مکمل اعانت حاصل تھی مگر 1857ء کی بغاوت کے بعد برطانوی حکومت جو پہلے پس پردہ تھی کھل کر سامنے آ گئی۔ مسلمان جنہیں اس بغاوت کا الزام دیا گیا تھا راندۂ درگاہ قرار دے دیئے گئے۔ سرکاری ملازمتوں کے لئے ان کا انتخاب ممنوع قرار پایا ہندوؤں کو مسلمانوں پر ترجیح دی گئی۔ ملازمتوں کے لئے دیئے جانے والے اشتہاروں میں یہ واضح کیا جانے لگا کہ مسلمان ناقابل قبول ہیں۔

برصغیر کے مسلمانوں کے لئے یہ کڑی آزمائش کا زمانہ تھا۔ ہندو ان سے متنفر تھے انگریز انہیں غدار سمجھتے تھے۔ ان کا بادشاہ جلا وطن کر دیا گیا تھا۔ شہزادے تمام کے تمام شہید کر دیئے گئے تھے۔ ان کے حکمرانوں کے ایوان ان سے چھین لئے گئے تھے شاہی خاندان کے افراد کو دو وقت کی روٹی ٹھیک سے میسر نہیں تھی۔ شاہی خاندان کی خواتین دہلی کے گلی کوچوں میں بھیک مانگ رہی تھیں۔ انگریزوں سے روابط ناممکن سے ہو رہے تھے مسلمانوں کے لئے یہ صرف سیاسی شکست ہی نہیں تھی۔ یہ ان کے پندار کی شکست بھی تھی۔ اور شکست بھی ایسی کہ اس پندار کو ریزہ ریزہ کر دیا گیا تھا۔ اس کے ٹکڑے ٹکڑے یوں بکھر گئے تھے کہ انہیں پھر سے یکجا اکٹھا کرنا ناممکن تھا۔ یہ تذلیل کی انتہا تھی اس کے آگے اور کچھ نہ تھا۔ مسلمان نوجوان دربدر کی ٹھوکریں کھاتے ادھر ادھر بھٹک رہے تھے۔ انگریز تو انہیں مزید کمزور کرنے کے حق میں تھا۔ اسی قدر کمزور کہ وہ پھر سے انگریز کے خلاف بغاوت کرنے کے اہل نہ رہیں۔ ہندو اسے محض آقاؤں کی تبدیلی تصور کرتے تھے اور انگریز کی خواہش بھی یہی تھی۔

مسلمانوں کی تعلیم کا نظام بھی درہم برہم ہو گیا۔ تعلیم کے لئے مسلمان علماء کی ریاست کی طرف سے اعانت کی جاتی تھی۔ انہیں غم روزگار سے بے نیاز کر دینے کے بعد ان سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ اپنی توجہ نوجوانوں کی تعلیم پر مرکوز کریں گے۔ مخیر حضرات بھی تعلیم کے لئے مالی امداد فراہم کرتے تھے۔ مدرسوں اور سکولوں پر خرچ ہونے والی رقم منتظمین کو آسانی سے مل جاتی تھی۔ انگریز حکومت نے تعلیم کے یہ تمام راستے

مسدود کر دیئے۔ انگریز نے اسلامی نظام تعلیم کو ختم کر کے اپنا طریق تعلیم رائج کر دیا۔ ہندو تو پہلے ہی انگریزی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ مسلمانوں نے اس طریق تعلیم کو اپنانے سے گریز کیا۔ ایک تو ان کا پندار راستے کی سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ اور پھر انہیں اپنی روایات اور تعلیمات پر مکمل یقین تھا۔ اور سب سے بڑا خوف عیسائی پادریوں کے اعلانات تھے۔ وہ بڑے تواتر سے یہ کہتے چلے آ رہے تھے کہ مغربی طرز تعلیم پرانے مذاہب کو ختم کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو گا۔ انگریز معلم انہی اصولوں پر کاربند تھے۔ ہنٹر نے کہا تھا کہ کوئی ہندو یا مسلمان طالب علم اپنے دین پر اپنے ایمان کو متزلزل کئے بغیر انگریز کے قائم کئے ہوئے سکولوں سے گزر نہیں سکتا ——— مسلم معاشرہ ساری دنیا میں انحطاط پذیر تھا۔ ستاون کی بغاوت کی ناکامی مسلمانوں کی بے بسی کی مظہر تھی۔ دنیا کی کوئی مسلم قوت ان کی اعانت کو نہیں آئی۔ حقیقت میں کوئی مسلم ملک اس قابل ہی نہیں رہا تھا کہ برصغیر کے مسلمانوں کی مدد کر سکتا۔ 1857ء کی ناکامی نے مستقبل میں مسلح بغاوت کے امکانات کو بالکل ختم کر دیا۔ مسلمانوں کا تفرد دینی تھا۔ انگریز انہیں ناقابل اعتبار سمجھتے تھے۔ مسلمانوں سے بوجہ عناد نے سکھوں کو انگریز کے ساتھ تعاون کا راستہ دکھایا تھا۔ بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر ہندوؤں نے انگریز سے وفاداری کے اظہار کو اپنے لئے زیادہ سود مند سمجھا۔ ان میں سے بہت سوں نے اپنی وفاداری کے ثبوت کے طور پر مسلمانوں کی مخبری بھی کی۔ چونکہ مسلمانوں کی ضبط شدہ جائدادیں سے ان کے خلاف مخبری کرنے والوں کو انعام ملتا تھا بہت سوں نے افترا کا سہارا لے کر اپنے مسلمان پڑوسیوں کی جائیداد ہتھیانے کے لئے ان کے خلاف جھوٹی شکایات کیں۔ یوں ہندوؤں سے مسلمان ناراض بھی ہوئے اور ان کے دلوں میں ہندوؤں کے خلاف تنفر کا ایک جذبہ بھی جاگزیں ہو گیا۔

ہندوؤں اور مسلمانوں میں جذباتی اور فکری ہم آہنگی کا فقدان تو تھا ہی ہندوؤں کی اس حرکت سے مسلمان اور بھی برہم ہو گئے۔ بدلے ہوئے حالات نے جو معاشی نظام تخلیق کیا اس نے دونوں کے درمیان پہلے سے موجود فاصلے کچھ اور طویل کر دیئے۔ برصغیر کے حالات میں مسلمانوں کا کردار داجبی سا رہ گیا۔ اس تشکیل کے اہم کردار ہندو اور انگریز تھے۔ انگریزوں نے مسلمانوں کے خلاف منظم انداز سے پراپیگنڈہ مہم کا آغاز کر دیا۔

نکھنوں کی کتابوں میں ان کے خلاف پراپیگنڈہ کا حقیقتوں سے دور کا تعلق بھی نہیں تھا۔ مسلمانوں کو زچ کرنے کے لئے تاریخی حقائق کو مسخ کر کے بیان کیا گیا۔ ہندوؤں کے دلوں یں مسلمانوں کے خلاف منافرت پیدا کرنے کے لئے وہ سب کچھ کیا گیا جو ان کے بس میں تا۔ انگریز نے یہ مذموم حرکت جان بوجھ کر کی اور چونکہ اس اختراع کو چیلنج نہیں کیا گیا۔ یہ تاریخ کا حصہ بن کے رہ گیا اور ہندو جو مسلمانوں کو پہلے ہی ناپسند کرتے تھے اب ان سے نفرت کرنے لگے۔

سرسید احمد خاں نے اس بالقصد کی جانے والی ناانصافی کو محسوس کیا اور اس کے ادراک کے لئے قدم اٹھایا۔ سید احمد خاں دہلی میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے اسلامی اقدار کے مطابق تعلیم حاصل کی۔ اور ان کے مذہبی عقائد شاہ اسماعیل شہید کے نظریات سے مطابقت رکھتے تھے۔ انہوں نے جوان ہو کر انگریز کی ملازمت اختیار کی اور بجنور میں صدر ان کے عہدے پر فائز ہوئے۔ ستاون کی جنگ آزادی میں یہ سمجھتے ہوئے کہ انگریز قدار کے خلاف بغاوت فاش غلطی ہے انگریز کے مفاد کے لئے خدمات انجام دیں۔ انہوں نے بجنور میں بہت سے انگریزوں کی جانیں بچائیں۔ انہیں محفوظ مقامات تک پایا۔ انگریز نے ان خدمات کے صلے میں انہیں جاگیر عطا کی۔ مگر انہوں نے اسے قبول نے سے یہ کہتے ہوئے کہ ان کی خدمت صلے کی غرض سے بے نیاز تھی انکار کر دیا ——— مسلمانوں کی حالت زار نے انہیں بے حد متاثر کیا۔ اور انہوں نے انگریز کو یہ کرانے کی کوشش کی کہ مسلمان غدار نہیں۔ انہوں نے بغاوت ہند کے اسباب کے لق ایک رسالہ تحریر کر کے اسے مقامی حکمرانوں میں بھی تقسیم کیا اور برطانوی یمنٹ کے ارکان کو بھی اس کی نقول ارسال کیں۔ اس میں انگریزوں کو بھی ہدف بنایا گیا تھا۔ کچھ نے سرسید احمد خاں کی اس جسارت کو ناپسند کیا۔ بہت سوں نے سراہا۔ پھر انہوں نے "وفادار مسلمان" کے نام سے ایک اور رسالہ لکھا اور یزوں کو یہ بتانے کی کوشش کی کہ برصغیر کے تمام مسلمان غدار نہیں تھے۔ میں سے بہت سے ایسے بھی تھے جنہوں نے انگریز کے مفادات کی نگہداشت کے لئے بڑی سے بڑی قربانی سے بھی دریغ نہیں کیا۔ انہوں نے مسلمانوں کو حصول تعلیم کی تلقین کی۔ علی گڑھ کالج کی بنیاد رکھی۔ مسلمانوں کے دلوں سے انگریز کے خلاف کدورت کو ختم

کرنے کی ہر ممکن کوشش کی۔ یوں مسلمانوں کے خلاف انگریز کی نفرت کی شدت کو بھی کم کرنے کے لئے جدوجہد کی۔ مسلمانوں کو مغربی کلچر اپنانے پر اکسایا۔ انگریز کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے اسلام کے روایتی تعلیمات کو بھی تنقید کا ہدف بنایا۔ 1885ء میں ایک انگریز نے انڈین نیشنل کانگریس کی بنیاد رکھی۔ چونکہ اس سیاسی جماعت کے نظریات پر ہندو مت کی چھاپ تھی مسلمان اس میں شمولیت سے گریزاں تھے۔ اس کے قائدین نے سرسید احمد خاں سے درخواست کی۔ انہوں نے یہ درخواست بڑی بے باکی سے مسترد کر دی اور مسلمانوں کو کانگریس میں شمولیت اختیار نہ کرنے کی نصیحت کی۔ سرسید احمد خاں نے تو مسلمانوں کو سیاست سے الگ تھلگ رہنے کا مشورہ دیا۔

بنارس کے ہندوؤں نے اردو ہندی کا تنازع کھڑا کیا تو سرسید برافروختہ ہوئے۔ ہندوؤں کی اس حکمت عملی پر انہیں یہ یقین ہو گیا کہ ہندو مسلمانوں کو ساتھ لے کر چلنے کے قائل نہیں۔ انہوں نے اپنی تقاریر میں مسلمانوں کو علیحدگی کی طرف مائل کیا۔ برصغیر کی دو قوموں کا ذکر بھی کیا۔ یوں برصغیر میں ایک رجحان کی تخلیق ہوئی۔ جسے مستحکم کرنے کے لئے بہت سوں نے بہت کچھ کیا۔

برصغیر کے اندرونی حالات پر مسلمانوں کی گرفت تو اٹھارھویں صدی ہی میں ڈھیلی پڑ چکی تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے بعد حالات نے اس تیزی سے پلٹا کھایا تھا کہ جاٹ اور سکھ تاراج گروں سے دہلی جو سلطنت کا پایہ تخت تھا کے مضافات بھی محفوظ نہ رہے تھے۔ ذاتی اغراض کے لئے منہ زور ہندو قبائل اور ہندو راجاؤں سے اعانت حاصل کرنے کا دستور تو عام تھا۔ ایک مہم جو مسلمان نے ہندو جاٹوں سے مرکز کے خلاف مدد طلب کر کے انہیں اور بھی دلیر کر دیا۔

حالات بگڑتے چلے گئے۔ ستاون کی جنگ آزادی میں شکست کے بعد مسلمان راہ گم کردہ مسافروں کی طرح ادھر ادھر بھٹکنے لگے۔ وہ اپنی منزل کا تعین نہیں کر پا رہے تھے اور نہ ہی انہیں ان اندھیروں سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ نظر آ رہا تھا۔ انگریز کا جبر ہندو کی نفرت اور قیادت کی عدم موجودگی ان کے لئے ایسے مسائل تھے جنہیں حل کرنا ان کے بس کی بات نہیں رہی تھی۔ اس دوران سرسید احمد منظر پر نمودار ہوئے۔ مسلمانوں کو سرنگ کے دوسرے سرے پر روشنی سی نظر آنے لگی۔ مگر ان کی اپروچ نے مسلمانوں کو برصغیر

کی سیاست سے بالکل الگ کر دیا۔ ایک انگریز بیورو کریٹ نے انڈین نیشنل کانگرس کی بنیاد رکھی۔ ہندو جوق در جوق اس میں شامل ہونے لگے۔ مسلمانوں کو سیاست سے علیحدگی کی تلقین کی گئی تھی۔ وہ کنارے پر کھڑے دریا کی طغیانی کا منظر دیکھتے رہے۔ ہندوؤں نے ردو ہندی کا جھگڑا کھڑا کر دیا۔ یو پی کے گورنر سے کہا گیا کہ صوبے میں ہندی کو اردو کی جائے سرکاری زبان بنایا جائے۔ سرسید احمد خاں کو ہندوؤں کی یہ بات اچھی نہیں لگی۔ نہیں معلوم تھا کہ مسلمان دیوناگری رسم الخط سے نا آشنا ہیں۔ ہندی کو اردو کی جگہ دے ی گئی تو مسلمانوں کی بدحالی میں بہت وقت نہیں لگے گا۔ انہوں نے ایک تو مسلمانوں کو انگریس میں شمولیت سے منع کیا۔ دوسرے ہندوؤں کی اس تحریک سے کچھ ایسے متاثر دئے کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے کبھی ایک نہ ہونے کے نظریئے کا پرچار کرنے لگے۔

برصغیر میں انگریز کے اقتدار سنبھالنے کے بعد ہندوؤں کے رویئے میں جارحیت کا یک عنصر پیدا ہو گیا تھا۔ انگریز کی طرف سے ان کی جا و بیجا اعانت اور مسلمان کی ہر ورت مخالفت اس عنصر کی تخلیق کی ذمہ دار تھی۔ مسلمانوں کے دلوں میں یہ احساس لزیں ہوتا جا رہا تھا کہ اس ملک میں قیامت تک انہیں اقلیت ہی کا درجہ دیا جائے گا۔ ر انہیں مستقل اقلیت بن کے گزر بسر کرنا ہو گی۔ ان کا حال تو بیچارگی اور خواری کا نذر ای دہ اپنے مستقبل سے بھی مایوس سے نظر آنے لگے۔

—— ابھی وہ ٹھیک سے حالات کا جائزہ بھی نہ لینے پائے تھے کہ بنگال کی تقسیم کا لان کر دیا گیا۔ بنگال ایک بہت بڑا صوبہ تھا۔ بہار' اڑیسہ اور آسام اس کا جزو تھے۔ ان ں اس کا رقبہ ایک لاکھ نوای ہزار مربع میل تھا اور آبادی سات کروڑ اسی لاکھ سے ادہ تھی۔ اس کی جسامت کی وجہ سے اس کا انتظام و انصرام آسان نہ تھا۔ انتظامی کلات اس قدر شدید تھیں کہ ان پر قابو پانا مشکل ہو رہا تھا۔ دارالحکومت تو کلکتہ تھا ر اس مرکز سے دور دراز علاقوں کا انتظام اور عوام الناس کی نگہداشت وقت طلب ہے۔ بدامنی کا دور دورہ تھا بار بار آنے والے سمندری طوفانوں کی ہلاکت آفرینیاں لوگوں حکومت سے بدظن کر رہی تھیں۔ ہر دو چار سال کے بعد قحط پھیل جاتا تھا۔ ذرائع آمد فت کچھ ایسے نہ تھے کہ متاثرین کو بروقت امداد پہنچائی جا سکتی ساری صنعت مغربی بنگال میں تھی۔ اور مشرقی بنگال سے دریائے ساحل ہوتے ہوئے مغربی بنگال کے کارخانوں کو

محض خام مال مہیا کرنے کا کام لیا جاتا تھا۔

مشرقی بنگال کی زیادہ تر زمین ہندوؤں کی ملکیت تھی۔ کاشتکار مسلمان تھے۔ اور ان کاشتکاروں کی روح تک ہندو مالک کے پاس رہن تھی۔ بے روزگاری اور غربت نے مسلمانوں اور تعلیم کے درمیان ایک دیوار سی کھڑی کردی تھی۔ مشرقی بنگال میں اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ صوبے کی اس تقسیم سے انگریز کا مقصد مسلمانوں کو فائدہ پہنچانا نہیں تھا۔ اس نے انتظامی مشکلات کو دور کرنے کے لئے یہ قدم اٹھایا۔ اس کی تقسیم کی تجویز کمپنی بہادر کے دور میں 1853ء میں پہلی بار پیش کی گئی۔ لارڈ ڈلہوزی نے بھی گورنر بنگال سے ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے اپنے افسران کو انگلستان میں اس کی مشکلات سے آگاہ کیا۔ 1866ء میں بہار کے قحط نے لاکھوں جانوں کا نذرانہ وصول کرنے کے بعد انگریز کو قحط کی وجوہات کی تحقیق کے لئے ایک کمیشن کی تشکیل پر مجبور کیا۔ اس کمیشن نے بھی بنگال کی جغرافیائی جسامت پر اعتراض کیا۔ اس کمیشن کی ہدایت پر کچھ اضلاع بنگال سے الگ کرکے ان کی ایک کمشنری بنادی گئی۔ سلٹ، کچھار اور گولپاڑہ اس کمشنری میں شامل تھے۔

فروری 1904ء ——— برصغیر کے وائسرائے لارڈ کرزن نے مشرقی بنگال کا دورہ کیا اور 20 جولائی 1905ء کو بنگال کی تقسیم کا اعلان کردیا گیا۔ صوبے کی تقسیم سے مسلمانوں کی بہتری کے مواقع نمودار ہوئے تو ہندو تیخ پا ہو گئے۔ کلکتہ کے مقابلے پر ڈھاکہ میں بھی ہائی کورٹ قائم ہو گئی۔ مسلمان وکلاء کو بھی کچھ کرنے کا موقع ملا۔ کلکتے کے ہندو وکلاء کی آمدنی کم ہوئی تو وہ چلائے۔ کلکتہ ان دنوں ذرائع ابلاغ کا مرکز تھا۔ بنگال کے تمام اخبار جو ہندوؤں اور انگریزوں کی ملکیت تھے یہیں سے شائع ہوتے تھے۔ صوبے کی تقسیم ہوئی تو کچھ اخبار ڈھاکہ سے شائع ہونے لگے۔ یہ اخبار مسلمانوں کے تھے۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے مفادات کی ترجمانی کے مقابلے کا آغاز ہو گیا۔ مسلمانوں نے ڈھاکہ اور اس کے نواح میں کارخانے قائم کئے۔ مشرقی بنگال کا خام مال انہیں ملنے لگا۔ ہندوؤں کی تجارت بھی متاثر ہوئی۔ ان حالات کے پیش نظر ہندوؤں نے اس تقسیم کے خلاف آواز اٹھائی۔ مظاہرے ہونے لگے۔ جلسے منعقد کئے گئے۔ جلوس نکالے گئے۔ انگریزی مصنوعات کا بائیکاٹ کردیا گیا۔ ہندو مظاہرین کی طرف سے لاقانونیت پھیلانے کی کوشش

کی گئی۔ احتجاج پر تشدد کا عنصر غالب آگیا سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا گیا۔ انگریزوں پر حملے کئے گئے۔ بم پھینکے گئے۔ بدامنی یوں پھیلی کہ انگریز سرکار تقسیم بنگال پر نظرثانی کرنے کے لئے آمادہ ہو گئی۔

1906ء میں آل انڈیا مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ اس سے قبل مسلمانوں کی برصغیر میں اپنی کوئی سیاسی جماعت نہ تھی۔ مسلمان سرسید احمد کی تشکیل کردہ محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس کے پلیٹ فارم ہی کو سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کرتے تھے۔ انگریز نے جب اردو کی بجائے یوپی میں ہندی کو سرکاری زبان بنانے کا اعلان کیا تو اجماعت پرست مسلمانوں کو اپنے مستقبل کا خیال آیا۔ پہلے 1901ء میں چند مسلمان زعماء لکھنؤ میں اکٹھے ہوئے اور انہوں نے پولیٹیکل ایسوسی ایشن کے نام سے ایک سیاسی جماعت قائم کی۔ 1905ء بنگال کی تقسیم پر جب ہندوؤں نے دہشت گردی کا سہارا لیتے ہوئے اس تقسیم کے خلاف احتجاج کیا تو انڈین نیشنل کانگریس نے مکمل طور پر ان کی اعانت کرکے اپنے آپ کو مسلمانوں سے اور بھی دور کرلیا۔ 1906ء میں جب برطانوی حکومت کی طرف سے سیاسی اصلاحات کا ذکر ہونے لگا تو مسلمانوں کو ایک نمائندہ تنظیم کی ضرورت محسوس ہوئی۔ دسمبر 1906ء مسلمانوں کا ایک وفد وائسرائے سے ملا اور مطالبہ کیا کہ

——— مجالس قانون ساز کے انتخابات کے لئے مسلمانوں کے علیحدہ حلقے قائم کئے جائیں۔

——— میونسپل کمیٹیوں میں بھی ہندو اور مسلمان اپنے اپنے نمائندے منتخب کر کے بھجوائیں۔

——— سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کا کوٹا مقرر کیا جائے۔

——— ہائی کورٹوں اور چیف کورٹوں میں مسلمان ججوں کا تقرر بھی کیا جائے۔

——— یونیورسٹیوں کے مختلف اداروں میں مسلمانوں کے لئے بھی نشستیں مختص کی جائیں۔

——— سرکار مسلم یونیورسٹی کے قیام کے لئے مدد فراہم کرے۔

وائسرائے کا ردعمل امید افزا تھا۔ اور یہ سرسید احمد خاں کی مساعی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں کے متعلق انگریزوں کا رویہ تبدیل ہو گیا تھا۔ وائسرائے نے یہ اعتراف بھی کیا

کہ ایک شخص ایک ووٹ پر مشتمل جمہوریت میں مسلمانوں کو نمائندگی نہ مل سکے گی۔ حکومت انگلشیہ ان کے مفادات کے نقصان کا تحفظ کرے گی اور ان کے حقوق کو نظرانداز نہیں کیا جائے گا۔

انگریز نے مسلمانوں کے مطالبات مان لئے۔ پنجاب، کلکتہ اور الہ آباد کی ہائی کورٹوں میں مسلمان ججوں کا تقرر کر دیا گیا۔ 1909ء میں کی جانے والی سیاسی اصلاحات میں مسلمانوں کو جداگانہ انتخاب کا حق ودیعت کر دیا گیا۔ یوں مسلمانوں کی جداگانہ حیثیت تسلیم کر لی گئی۔ اور ستاون کی شکستگی اور تحقیر کے بعد مسلمانوں کے چہروں پر پہلی بار اطمینان کے آثار نظر آنے لگے۔ فائدہ چونکہ مسلمانوں کو ہوا تھا۔ بدیں وجہ ہندو ردعمل شدید تھا۔ مسلمانوں کی نشستیں الگ ہو گئیں۔ مسلمان بڑی عدالتوں کے جج بنا دیئے گئے۔ مسلمانوں کے لئے سرکاری ملازمتوں کا کوٹا تسلیم کر لیا گیا۔ بنگال کی تقسیم کی تنسیخ کا اعلان بھی نہیں کیا گیا۔ ہندوؤں کے اخباروں نے آسمان سر پر اٹھا لیا۔ ان اقدامات کو ہندو قوم کے خلاف ناپاک سازش قرار دیا گیا اور انگریز مسلم گٹھ جوڑ کی سرعام مذمت کی گئی۔

مسلم لیگ کے قیام کے مقاصد کے متعلق کہا گیا کہ

—— مسلم لیگ مسلمانوں میں برطانوی حکومت کے لئے وفاداری کا جذبہ پیدا کرے گی۔

—— حکومت کی طرف سے کی جانے والی کاروائیوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی غلط فہمیوں اور تنازعات کو ختم کرے گی۔

—— مسلمانوں کے مطالبات حکومت تک پہنچائے گی اور ان کے مفادات کا تحفظ کرے گی۔

—— دوسری ملتوں کے خلاف مسلمانوں کے دلوں میں پیدا ہونے والی مخاصمت کا تدارک کرے گی۔

قائداعظم ان دنوں کانگریس کے رکن تھے۔ دوسرے بہت سوں کی طرح ان کی بھی یہ خواہش تھی کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان فاصلے ختم ہو جائیں۔ مسلم لیگ کے وجود میں آنے سے کانگریس کو بھی خدشات لاحق ہو گئے تھے۔ کانگریسی قائدین کو یہ اندازہ ہو گیا تھا کہ مسلمان مزاحمت کے بغیر اپنے مفاد کے خلاف کوئی تجویز قبول نہیں

کریں گے۔ انہوں نے مسلمانوں کی طرف مفاہمت کا ہاتھ بڑھایا مگر تقسیم بنگال کی تنسیخ کے لئے ان کے اقدامات رکاوٹ بن کر سامنے آگئے اور مفاہمت نہ ہو سکی۔

—— 1911ء میں انگلستان کے بادشاہ جارج پنجم دہلی آئے۔ دہلی میں ان کا دربار سجایا گیا اور انہوں نے انگریز کی روایتی مسلم دشمنی کا سہارا لیتے ہوئے تقسیم بنگال کی تنسیخ کا اعلان کر دیا۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان مفاہمت کے امکانات معدوم سے ہو کر رہ گئے۔

انگریزی ریکارڈ کے مطابق ان کے عہد میں پہلا ہندو مسلم فساد 1809ء میں بنارس میں ہوا۔ اور اس کے بعد ہندو مسلم فساد باقاعدگی سے ہونے لگے۔ پہلی جنگ عظیم شروع ہوئی۔ انگریز کو جنگ جیتنے کے لئے برصغیر کی اشد ضرورت تھی۔ وہ برصغیر کو چھوڑنے کے لئے تیار نہ تھا۔ اس نے سیاسی مراعات کے وعدہ کے ذریعہ اہل ہندوستان کو مطمئن کئے رکھا۔ ترکی چونکہ اس کے خلاف جنگ میں جرمنی کے ساتھ تھا۔ جنگ کے اختتام پر ناانصافیوں کا آغاز ہوا۔ ترک مسلمان تھے۔ عیسائی یورپ سے ان کی دیرینہ عداوت تھی۔ روس جو اپنے آپ کو سلاوی عیسائی اقوام کا نگہدار سمجھتا تھا۔ ترکی کا بدترین دشمن تھا۔ جرمنی اور اس کے اتحادیوں نے جنگ میں شکست کھائی۔ فاتحین نے مفتوحین سے انتقام لینے کی ٹھانی اور انہیں اس قدر زچ کیا کہ وہ فاتحین کا مقابلہ کرنے کے لئے پھر سے تیار ہو گئے۔

ترکی میں عثمانی حکومت زوال پذیر تھی۔ یورپ کے لوگ اسے یورپ کا مرد بیمار کے نام سے پکارتے تھے۔ انہیں امید تھی کہ یہ مرد بیمار جانبر نہ ہو سکے گا۔ انہوں نے اس کے مقبوضات کی تقسیم کے فیصلے کر رکھے تھے۔ ترکی کا عثمانی حکمران خلیفہ کہلاتا تھا۔ اور برصغیر کے مسلمان خلافت کو مسلمانوں کے عروج کی علامت سمجھتے تھے۔ انگریزوں نے جنگ کے خاتمے پر ترکیہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تو برصغیر کے مسلمان مشتعل ہو گئے۔ مہاتما گاندھی نے موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مسلمانوں کی طرف سے چلائی جانے والی تحریک خلافت کی قیادت سنبھال لی۔ یوں ہندو اور مسلمان اپنے اختلافات پس پشت ڈال کر عارضی طور پر ایک دوسرے سے مل بیٹھے۔ مولانا محمد علی جوہر بھی مہاتما گاندھی کے ساتھ تھے۔

مسلمانوں نے ملک کے طول و عرض میں جلسے منعقد کئے۔ مولانا محمد علی جوہر نے اپنی تحریروں اور تقریروں سے مسلمانوں میں پھر ایک بار ایثار اور قربانی کا جذبہ پیدا کر دیا اور وہ ترکوں کے لئے اپنا سب کچھ قربان کر دینے کے لئے تیار ہو گئے۔ ترکی کے معاملے میں مسلمانوں کے لئے انگریزوں کا کردار قابل نفرین تھا۔ ہندو زعماء تحریک خلافت کو بنظر استحسان نہیں دیکھتے تھے۔ وہ اسے پان اسلام ازم کا احیاء متصور کرتے تھے۔ مہاتما گاندھی کا تحریک سے الحاق انہیں ناپسند تھا اور مہاتما کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھے جو ان کے لئے تحریک خلافت سے علیحدگی کا جواز پیدا کر دے۔ چورا چوری کے سانحے نے (مظاہرین نے چورا چوری میں ایک تھانے پر حملہ کر کے پولیس کے تیرہ سپاہیوں کو ہلاک کر دیا تھا) انہیں یہ موقع فراہم کر دیا۔ وہ تحریک سے الگ ہو گئے۔

لالہ لاجپت رائے نے سی آر داس کو اپنے ایک خط میں لکھا تھا۔ میں ہندوستان کے سات کروڑ مسلمانوں سے خائف نہیں مگر میرا خیال ہے کہ ان سات کروڑ کے علاوہ افغانستان' وسط ایشیا' عربستان' میسوپٹیمیا اور ترکی کے اسلامی جنود کے خلاف مزاحمت ممکن نہیں ہو گی (حسن عسکری نے ڈان میں حوالہ دیا) ہندو مہاسبھا کے کانپور میں 1925ء میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں سبھا کے صدر این۔ سی کیلکر نے ہندوؤں کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ مسلمان انگورہ (انقرہ) سے سہارنپور تک تسلط جمانے کی فکر میں ہیں۔ سر رابندر ناتھ ٹیگور نے بھی برصغیر میں مسلمانوں کی وفاداری کو مشکوک قرار دیتے ہوئے ہندو مسلم اتحاد کو بعید از قیاس قرار دیا تھا۔

تحریک خلافت کے دوران پیدا ہونے والا ہندو مسلم اتحاد دیر تک قائم نہیں رہ سکا۔ جنوبی ہند میں آباد موپلا بغاوت نے اس یگانگت کو پارہ پارہ کر دیا۔ موپلا جنوبی ہند کے مغربی ساحل پر آباد عربوں اور ہندوؤں کی مخلوط نسل ہے۔ موپلا ملیالم زبان کا لفظ ہے۔ اس کا مطلب ہے عظیم بچہ۔ یہ مسلمان اپنا رشتہ ان عرب تاجروں سے ملاتے ہیں جو مسالے اور ہاتھی دانت کی تجارت کی غرض سے اس علاقے میں آئے تھے۔ انہوں نے مقامی باشندوں سے ازدواجی تعلقات قائم کر کے مستقل طور پر یہیں سکونت اختیار کر لی۔ موپلے ہندو ساہوکاروں کے سلوک سے نالاں تھے۔ ان ساہوکاروں اور ان زمینداروں کے خلاف جن کی زمینوں پر موپلے ملازم تھے کارروائی کا آغاز ہوا۔ بات بڑھتی گئی۔ مقامی

انتظامیہ نے مسئلے کو سلجھانے کی سنجیدہ کوشش نہیں کی۔ بات اتنی بڑھی کہ بغاوت ہو گئی۔ بغاوت کو سختی سے کچل دیا گیا۔ لاتعداد موپلے موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ انہیں مال گاڑیوں سے ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا گیا۔ بہت سے اس سفر کے دوران دم گھٹنے سے جاں بحق ہو گئے۔ بغاوت فرو ہوئی تو ہندوؤں سے ان کے سلوک کی داستانیں سنائی جانے لگیں ــــــ تاریخی حقائق کو مسخ کر کے غلط بیانی سے فائدہ اٹھانا حکمرانوں کا شعار رہا ہے۔ یہ نہیں کہ موپلوں نے ہندوؤں پر تشدد نہیں کیا۔ مگر ان کہانیوں کو بڑھا چڑھا کر بیان کیا گیا۔ اور تحریک خلافت کے دوران قائم ہونے والا اتحاد چکنا چور ہو گیا۔ ایسے واقعات کے ردعمل کے طور پر فسادات تو ہوا کرتے ہیں۔ فساد شروع ہوئے۔ نقصان دونوں کا ہوا۔ ایک دوسرے کے قریب ہونے کی خواہش ختم ہو کے رہ گئی۔

موپلا بغاوت سے چار سال قبل بہار کے بعض علاقوں میں مسلمانوں پر منظم حملے کئے گئے۔ اس کے بعد کرتار پور اور ہردوار میں بلوے ہوئے۔ انیس مسلمان زندہ جلا دیئے گئے۔ مرہٹہ قائد ڈاکٹر مونجے نے مسلمانوں کے خلاف ہندوؤں کو منظم کرنے کی تحریک شروع کی۔ اسے سنگھٹن کا نام دیا گیا۔ مقصد یہ تھا کہ ہندوؤں کو متحد کر کے ضرورت کے وقت منظم کارروائی کے لئے تیار کیا جائے۔ تحریک انگریز کے نہیں مسلمانوں کے خلاف تھی۔ مسلمان دکانداروں کے بائیکاٹ کا آغاز بھی انہی دنوں ہوا۔ مسلم دستکاروں اور کاریگروں کو بے روزگار کرنے کے لئے ان کا بائیکاٹ بھی کیا گیا۔

چورا چوری کے سانحے کے بعد جس کو جواز بنا کے مہاتما گاندھی نے تحریک خلافت سے علیحدگی اختیار کی تھی ایک ہندو قائد شردھانند نے ملکانی راجپوتوں کو پھر سے ہندو بنانے کا منصوبہ بنایا۔ اسی شردھانند کو مسلمانوں نے جامع مسجد دہلی میں ایک مسلمان اجتماع سے خطاب کرنے کا شرف بخشا تھا۔ شدھی اور سنگھٹن کے مقاصد کے متعلق ایک ہندو قائد ہردیال کا بیان واضح انداز میں ہندوؤں کے عزائم کی نشاندہی کرتا ہے۔ ہردیال نے کہا ــــــ ہندوستان اور پنجاب کے ہندوؤں کے مستقبل کا انحصار مندرجہ ذیل نکات پر ہے۔

ــــــ ہندو سنگھٹن

—— ہندو اقتدار —— ہندو راج ——

—— مسلمانوں کی "شدھی" مراد ہے مسلمانوں کو پھر سے ہندو بنا کے "پاک" کرنے کی تحریک

—— افغانستان اور سرحدی علاقوں کی "شدھی"

ہندو قوم کی تاریخ ایک ہے اور اس کے اداروں میں مجانست ہے۔ مسلمان اور عیسائی ہندو مت سے الگ ہیں۔ ان کے مذاہب غیر ملکی ہیں۔ انہیں فارسی۔ عربی اور یورپی اداروں سے محبت ہے۔ ان دونوں مذاہب کی شدھی ازبس ضروری ہے۔ افغانستان اور سرحد کے کوہستانی علاقے پہلے ہندوستان کا حصہ تھے۔ مگر آج کل اسلام کے قبضے میں ہیں۔ جس طرح نیپال میں ہندو مت موجود ہے۔ افغانستان اور قبائلی علاقوں میں بھی اسے وہی مقام ملنا چاہیے کوہستانی قبائل جنگجو بھی ہیں اور بھوکے بھی۔ اگر وہ ہمارے دشمن بن گئے تو نادر شاہ اور زمان شاہ کا دور پھر سے لوٹ آئے گا۔ ہندوؤں کو اپنی حفاظت کے لئے افغانستان اور سرحدی علاقوں کو فتح کرنا ضروری ہے —— تحریک خلافت نے ہندوؤں اور مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے کر دیا تھا۔ مگر چونکہ ہندو قائدین اس کے مضمرات سے خائف تھے تحریک ہندوؤں کی حمایت سے محروم ہو گئی۔ اور اس یگانگت کے ختم ہوتے ہی برصغیر میں ہندو مسلم فسادات پھوٹ پڑے۔ شدھی اور سنگھٹن کی تحریکوں نے ہندوؤں میں خود اعتمادی کا ایک جذبہ پیدا کر دیا تھا۔ اور گاندھی جی نے مسلمان کو دھونسیا (BULLY) اور ہندو کو بزدل قرار دے کر ہندو کو بزدلی ترک کرنے کی ہدایت کی تھی۔ یہ غالباً اسی کا اثر تھا کہ کوہاٹ میں جہاں ہندو ناقابل ذکر اقلیت میں تھے ایک شاعر نے اسلام کو چیلنج کر کے اس کے مقدس مقامات کی تحقیر کی۔ فساد ہوا تو ہندوؤں کو مسلمانوں کی بہ نسبت زیادہ نقصان پہنچا۔ اور گاندھی جی اس پر سخت برہم ہوئے۔ فسادات کی وجوہ معلوم کرنے کے لئے گاندھی جی اور مولانا شوکت علی پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی گئی۔ مولانا شوکت علی کا خیال تھا کہ فساد ہندوؤں نے شروع کئے۔ گاندھی جی کو ان سے اختلاف تھا۔ بات وہیں کی وہیں رہ گئی۔

اس سے قبل کانپور میں مسجد کے تنازع پر پولیس کی گولیوں سے پچیس تیس مسلمان شہید ہو چکے تھے۔ کانپور میں اس معاملے میں مسلمانوں سے سراسر زیادتی کی گئی۔

مچھلی بازار کی سڑک کے عین وسط میں بنے ہوئے مندر کو گرانے سے احتراز کیا گیا حالانکہ یہ مندر محض مسجد کے سامنے جان بوجھ کر تعمیر کیا گیا تھا۔ مگر سڑک کو کشادہ کرنے کے لئے مندر کو گرانا مناسب نہ سمجھا گیا۔ مسجد کا ایک حصہ شہید کر دیا گیا۔ مسلمانوں نے احتجاج کیا تو ان پر گولیاں برسائی گئیں۔ اور احتجاج کرنے والے تمام کے تمام نوخیز جوان تھے۔

—— اور ہردیال کی جو ایک جلاوطن انقلابی تھے تحریروں نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ مسلمان برصغیر میں صدیوں تک قیام کے باوجود اس کے ساتھ اپنی تطبیق میں ناکام رہے ہیں۔ انہیں بیرونی طور طریقے چھوڑ دینے چاہئیں۔ خالص ہندوستانی طرز زندگی اپنانا چاہیے۔ ہندو نام اختیار کرنے چاہئیں اور ہندوؤں کے دیومالائی قائدین کا احترام کرنا چاہیے۔

—— حالات اس نہج پر پہنچ گئے کہ ہندو قائدین نے بیانگ دہل یہ اعلان کرنا شروع کر دیا کہ ہندو اور مسلمان ایک نہیں ہو سکتے۔ لالہ لاجپت رائے اور ہندو مہاسبھا کے صدر ویر ساورکر دونوں بصیرت والے قائد تھے۔ دونوں نے ہندوؤں اور مسلمانوں کی ناچاقی کو ناقابل تحلیل قرار دیتے ہوئے ہندوؤں اور مسلمانوں کو الگ الگ قوم تسلیم کرنے سے گریز نہیں کیا۔

—— قائداعظم ہندو مسلم اتحاد کے بہت بڑے داعی تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کے لئے جداگانہ انتخاب کے نظریئے کو بھی پسند نہ کیا تھا اور تحریک خلافت سے بھی الگ رہنے کی کوشش کی تھی۔ قائداعظم اور قدامت پسند مسلمانوں کے درمیان اختلاف کی بڑی وجہ ان کا ہندو مسلم اتحاد پر اصرار تھا۔ جب سائمن کمیشن برصغیر آیا تو کانگریس اور قائداعظم دونوں نے اس کی پذیرائی سے انکار کر دیا۔ خلافت کمیٹی ختم ہو چکی تھی اور مسلمانوں کے مستقبل کے متعلق پالیسی سازی کا کام 1906ء میں قائم ہونے والی مسلم لیگ نے سنبھال لیا تھا۔ قائداعظم نے مسلم لیگ میں شمولیت تو اختیار کر لی تھی مگر ہندو مسلم اتحاد کی ضرورت کے نظریئے پر بدستور قائم تھے۔ سائمن کمیشن آیا تو مسلم لیگ دو دھڑوں میں بٹ گئی۔ انگریزی اقتدار کے حامی سر محمد شفیع کی قیادت میں کمیشن سے تعاون کے حامی تھے۔ سر محمد شفیع نے لاہور میں اپنے حامیوں کا اجلاس طلب کیا اور قائداعظم نے اپنے حامیوں کو کلکتے میں اکٹھے ہونے کے لئے کہا۔ اگر کانگریسی زعماء ویر ساورکر اور لالہ

لا بہت رائے کی طرح اہل بصیرت ہوتے تو مسلم لیگ کی اس فرقہ بندی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے لبرل مسلم قائدین سے مفاہمت کر لیتے۔ مگر حالات سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مفاہمت ان کا نصب العین نہیں تھا۔ انہیں برصغیر میں ہندو اکثریت پر زعم تھا اور وہ اقلیت کو کچھ دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ ان کی طرف سے نہرو رپورٹ پیش کر دی گئی۔ موتی لال نہرو کی طرف سے مرتب کی جانے والی اس رپورٹ میں برصغیر میں وفاق کی بجائے وحدتی طرز حکومت کے قیام کی سفارش کی گئی۔ مسلمانوں کے لئے جداگانہ طریق انتخاب کو ختم کر دینے کا اعلان کیا گیا اور یہ بات واشگاف الفاظ میں واضح کر دی گئی کہ اقلیت کو کتنی ہی مراعات کیوں نہ دے دی جائیں آخر اقلیت ہے اور اقلیت ہی رہے گی۔

قائداعظم نے کلکتہ میں کانگریسی زعماء سے مسلمانوں کے نقطہ نظر کو قبول کر لینے کی پرزور اپیل کی۔ انہوں نے اپنے چودہ نکات نہرو رپورٹ میں ترمیم کے طور پر پیش کیے۔ مگر ہندو قیادت نے ان کے چودہ نکات کو یکسر مسترد کر دیا۔ سر شفیع نے قائداعظم کی ہزیمت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دہلی میں آل انڈیا مسلم کانفرنس کا اجلاس طلب کیا۔ مولانا محمد علی کی شرکت نے اسے قابل اعتبار تو ضرور بنا دیا مگر یہ وقار زیادہ دیر تک قائم نہیں رہ سکا۔ قائداعظم کو اس کانفرنس میں مدعو نہیں کیا گیا۔ وہ مسلمانوں کے واحد رہنما تھے جو اس اجلاس سے الگ رہے۔ ان کا قصور یہ تھا کہ وہ ہندو مسلم اتحاد کے حامی تھے اور دوسرے مسلمان قائدین کو ان کے اس نظریئے سے شدید اختلاف تھا۔ ان کے متعلق یہ کہا جا رہا تھا کہ وہ ضرورت سے زیادہ قوم پرست ہیں۔ اور غالباً انہی وجوہ کی بنا پر قائداعظم وطن چھوڑ کر انگلستان چلے گئے۔ ان کا ارادہ وہاں مستقل سکونت اختیار کرنے کا تھا۔ بالآخر مسلمان قائدین انہیں واپسی کے لئے تیار کرنے میں کامیاب ہو گئے۔

—— مسلمان یہ محسوس کرنے لگے کہ مغربی جمہوریت انگریز کے رخصت ہو جانے کے بعد انہیں انگریز سے تو نجات دلا دے گی مگر ہندوؤں کی بالادستی سے نجات نہیں مل سکے گی۔

—— ستاون کی شکست کے بعد ایک ہولناک تنہائی کا احساس مسلمانوں کے رگ و پے میں سرایت کر گیا تھا۔ انہوں نے ہندوؤں سے مفاہمت کی کوشش کی۔ انہیں بیدردی سے دھتکار دیا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ اگر وہ برصغیر میں رہنا چاہتے ہیں تو اپنا

تشخص فراموش کر دیں۔ اگر وہ اسے بھولنے کے لئے تیار نہیں تو انہیں اقلیت کی حیثیت سے اکثریت کا غلام بن کے رہنا پڑے گا۔ سیاسی مراعات کے لئے انگریز پر دباؤ بڑھ رہا تھا۔ یورپ کے حالات میں ابتری کے آثار تھے انگریز کو برصغیر کی ضرورت تھی۔ برصغیر کے لوگوں کی حمایت حاصل کرنے کے لئے 1935ء کا گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ پاس کیا گیا۔ صوبوں میں ذمہ دار حکومتوں کا قیام عمل میں آیا۔ صوبے کے گورنروں کو اقلیتوں کے جائز حقوق کی نگہداشت کی ذمہ داری سونپی گئی۔ مسلم لیگ انتخابات میں تو کامیابی حاصل نہ کر سکی۔ کانگریس نے گیارہ میں سے سات صوبوں میں حکومت قائم کر لی۔ یو پی میں لیگیوں سے کہا گیا کہ وہ اپنی تنظیم ختم کر کے کانگریس میں شامل ہو جائیں۔ سکولوں کو سکولوں کی بجائے ودیا مندر کہا جانے لگا۔ بمبئی میں مسلمان طلباء کو ایسی کتابیں پڑھنے پر مجبور کیا گیا جو اسلام کے نظریات کے خلاف تھیں۔ سکولوں کے مسلمان طلباء کو "بندے ماترم" کا گیت گانے پر مجبور کیا گیا۔ (بندے ماترم بنکم چندر چیٹرجی کے مسلمانوں کے خلاف لکھے ہوئے ایک ناول سے ماخوذ ہے۔ جو ایک ہندو کے مسلمان جاگیردار کے خلاف جہاد کی کہانی ہے) پنجاب میں انہیں ہر انداز اور ہر طریق سے زچ کرنے کی کوشش کی گئی۔ بالآخر مسلمانوں کو یہ اندازہ ہو گیا کہ ہندو اکثریت کے راج میں ان کے ساتھ کیا سلوک روا رکھا جائے گا۔ مسلمان بچوں کو مہاتما گاندھی کی تصویر کے سامنے ہاتھ جوڑ کے ہندوؤں کے انداز میں پوجا کرنے پر مجبور کیا گیا۔ کانگریس کی واردھا کی تعلیمی سکیم پر عمل کرتے ہوئے مسلمانوں کے مذہب اور ان کے کلچر کو بالکل نظر انداز کر دیا گیا۔ اس امتیازی سلوک کو ہندو مسلم اتحاد کے "سفیر" قائداعظم نے بھی محسوس کیا اور وہ مسلمانوں کے حقوق کے علمبردار کی حیثیت سے سیاسی منظر پر نمودار ہوئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بلند و پست پر چھا گئے۔ برصغیر کے مسلمانوں نے ان کی قیادت کو تسلیم کر لیا۔

—— دو قومی نظریئے کے متعلق باتیں تو شروع ہو چکی تھیں۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی علیحدگی کے تذکرے بھی ہونے لگے تھے۔ اہل بصیرت یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ انگریز کے بعد ہندو کے ساتھ رہنا مشکل ہے۔ ہندو زعماء بھی کچھ سوچ رہے تھے۔ انہیں خدشہ تھا کہ مسلمان خاص طور پر شمال مغرب اور پنجاب میں آباد مسلمان پڑوسی مسلمان ممالک سے اتحاد قائم کر کے برصغیر کے ہندوؤں کے لئے مشکلات پیدا کر

دیں گے۔ انھیں خطرہ خاص طور پر صوبہ سرحد کے پٹھانوں اور افغانستان کے مسلمانوں سے تھا۔ 1930ء میں علامہ اقبال نے بھی برصغیر کے شمال مغرب میں صوبہ سرحد' پنجاب' سندھ اور بلوچستان کے انضمام کے بعد ایک خود مختار مسلمان ریاست کا تصور پیش کیا تھا۔ اور انگلستان میں مقیم ایک مسلمان طالب علم چودھری رحمت علی نے اس نظریئے کی تشہیر پر اپنی ساری توجہ مرکوز کر دی۔ انھوں نے اس نئی ریاست کا نام پاکستان تخلیق کیا۔ ان کی اس جسارت پر ہندو سخت برہم تھے۔ افرنگ کا رویہ معاندانہ تھا۔ اور مسلمان قیادت کی سرد مہری اور برودت بھی اسے ناقابل قبول قرار دے رہی تھی۔ مگر چودھری رحمت علی کی مساعی بار آور ثابت ہو رہی تھیں۔ حصول تعلیم کے لئے انگلستان میں مقیم مسلمان طلباء چودھری صاحب کے ہم خیال ہوتے جا رہے تھے۔ برصغیر کے مسلمان بھی یہی کچھ سوچنے لگے تھے۔ سات صوبوں میں کانگریسی حکومتوں کے قیام سے انھیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ آئینی یقین دہانیاں اور دستوری مراعات کاغذ پر موجود ہونے کے باوجود ان کے کسی کام کی نہیں۔ اکثریت اگر ان پر عمل کرنے سے انکار کر دے تو اقلیت کچھ نہیں کر سکتی۔ جمہوری طرز حکومت میں بالادستی اکثریت ہی کو حاصل ہوتی ہے۔ اور برصغیر میں ان کی آبادی ہندوؤں کی آبادی کا پانچواں حصہ ہے۔

بات چل نکلی۔ بات بڑھی۔ اور 23 مارچ 1940ء کو لیگ کے قیام کے چونتیس سال بعد برصغیر کے مسلمانوں نے اپنی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کے ذریعہ لاہور میں منعقد ہونے والے ایک اجلاس میں ہزاروں افراد کی موجودگی میں اپنے لئے ایک الگ وطن کا مطالبہ کر دیا۔ مسلمانوں کی وہ ہولناک تنہائی ستاون کی شکست نے جسے جنم دیا تھا۔ ختم ہو گئی۔ انھوں نے برصغیر میں ورود کے بعد اپنی منزل کا تعین کر ہی لیا۔ اور وہ منزل تھی
——پاکستان——

پاکستان کا نعرہ بلند ہوا۔ برصغیر میں تہلکہ سا مچ گیا۔ ہندوؤں اور انگریزوں کو 1857ء کے بعد شاید پہلی بار یہ معلوم ہوا کہ یہاں مسلمان بھی رہتے ہیں اور وہ اپنے جائز حقوق کے تحفظ کے لئے قربانی دینا بھی جانتے ہیں۔ اس نظریئے کو جھٹلانے کی کوشش کی گئی۔ اسے ختم کرنے کے لئے کئی طریقے ایجاد کئے گئے۔ مسلمانوں کو سبز باغ دکھائے گئے۔ ان میں نفاق پیدا کرنے کی سعی کی گئی۔ انھیں ڈرایا گیا۔ انھیں دھمکایا گیا۔ پہلے سٹیفورڈ کرپس

کی سرکردگی میں ایک وفد بھیجا گیا۔ پھر برطانیہ کا ایک وفد آیا۔ ان وفود نے برصغیر کی یکجہتی کے لئے بھرپور کوشش کی۔ قائداعظم نے ان کی بعض تجاویز سے اتفاق بھی کر لیا۔ مگر انگریز مسلمانوں کو اکاموڈیٹ کرنے کے لئے تیار نہ ہوئی——

——برصغیر کی تقسیم کی تجاویز بہت سوں نے پیش کیں کہتے ہیں شہاب الدین وردی نے پرتھوی راج چوپال کو بھی تقسیم کی تجویز پیش کی تھی۔ فرقہ وارانہ فسادات کے ل کے لئے جان برائٹ' علامہ افغانی' عبدالحلیم شرر' تھیوڈر' مارلیس' سردار گل محمد ان' بھائی پرمانند' لالہ لاجپت رائے' مولانا محمد علی جوہر اور دوسرے بہت سوں نے تقسیم و مناسب ذریعہ قرار دیا۔ مگر اس کو پذیرائی اس وقت ملی جب مسلم لیگ نے برصغیر کے سلمانوں کی نمائندہ سیاسی جماعت کی حیثیت سے لاہور میں 1940ء میں اس کا باقاعدہ طالبہ کر دیا۔

1939ء میں یورپ میں ایک اور جنگ چھڑ گئی۔ یہ جنگ 1919ء میں ہونے والے رسائے کے امن معاہدے کی سنگین اور تحقیر آمیز شرائط کا رد عمل تھی۔ پہلی جنگ عظیم یتنے والے نے مفتوحین کے لئے اس قدر سخت اور ذلت آمیز شرائط رکھی تھیں کہ ان کے بعد ان شرائط کو قبول کرنے کے لئے کسی صورت تیار نہ ہوئے۔ اس حقیقت کا ثبوت ں امر سے ملتا ہے کہ جرمن ڈکٹیٹر ہٹلر نے فرانس کی شکست کے بعد شکست کی دستاویز پر ستخطوں کے لئے ریل کا وہ ڈبہ استعمال کیا جو فرانسیسی جرنیل مارشل فاش نے پہلی جنگ ظیم میں جرمنی کو شکست دینے کے صلح نامے پر دستخطوں کے لئے استعمال کیا تھا۔ یورپ کے ممالک پکے ہوئے پھلوں کی طرح جرمنوں کی جھولی میں گرنے لگے۔ جرمن افواج کی فار سے انگریز ہراساں ہوئے برصغیر میں ان کے خلاف مظاہروں کا آغاز ہوا۔ خدشہ یہ یدا ہو گیا کہ کہیں مجبور ہو کر برصغیر سے بھی نہ بھاگنا پڑے برصغیر کے قائدین کو تسلی ینے کے لئے وفود بھجوائے گئے۔ اسٹفورڈ کرپس (Stafford Cripps) مشن اسی سلسلے ں ایک کڑی تھی۔

کرپس چرچل کی قومی کابینہ کے رکن تھے اور برطانوی دارالعوام کے قائد بھی ھے۔ ان کا شمار اہل بصیرت سوشلسٹوں میں ہوتا تھا۔ انھیں جرمنوں کے خلاف سوویت یونین کی اعانت حاصل کرنے کے لئے ماسکو بھیجا گیا تھا۔ اور وہ اس کامیاب دورے سے

لوٹے ہی تھے کہ انہیں برطانوی حکومت نے برصغیر کے سیاسی مستقبل سے متعلق ایک دستاویز دے کر برصغیر بھیجا۔ کرپس اس سے پہلے پنڈت نہرو کی دعوت پر انالیس میں بھی برصغیر آئے تھے۔ اور انہی کے مہمان کی حیثیت سے کچھ دیر یہاں رہے تھے۔ اسی دوران کانگریسی زعماء سے ان کے تعلقات استوار ہو گئے تھے۔ کانگریسی قائدین سے ان کے گہرے تعلقات کی بنا پر مسلم لیگی حلقوں میں انہیں بنظر استحسان نہیں دیکھا جاتا تھا لارڈ ایمری (Amery) نے اپنی تصنیف میں ان کے متعلق لکھا ہے کہ وہ بہت سادہ طبیعت انسان تھا۔ اپنی قابلیت اور صلاحیتوں کے باوجود سیاست اور خاص طور پر برصغیر کی سیاست سے متعلق ان کا نقطہ نظر بہت ہی "معصوم" تھا۔ قائداعظم سے پہلی ہی ملاقات میں انہوں نے کانگریس کے قائدین سے اپنے تعلقات کے متعلق اپنے تمام بیانات سے لاتعلقی کا اظہار کرتے ہوئے قائداعظم کو اپنی غیر جانبداری کا یقین دلانے کی کوشش کی۔ انہوں نے قائداعظم سے کہا کہ ان کے دو اڑھائی سال پہلے کے خیالات ان دنوں کے حالات سے اخذ کردہ تھے۔ اور میں نے اسی کے پیش نظر پاکستان کے پراپیگنڈے کو سیاسی داؤ قرار دیا تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ اب تحریک پاکستان کی مقبولیت کے پیش نظر ان کے خیالات تبدیل ہو چکے ہیں۔

برطانوی حکومت نے اپنی اس دستاویز میں مستقبل میں برصغیر کو ڈومینین (Dominion) کا رتبہ دے کر اسی مرتبہ کے دوسرے ممالک کے ساتھ برطانیہ کے ساتھ منسلک رہنے کی امید کا اظہار کیا تھا۔ فیصلہ یہ کیا گیا تھا کہ جنگ کے اختتام پر برصغیر کے لئے آئین بنانے کی غرض سے ایک ادارے کا قیام عمل میں آئے گا۔ برصغیر کی ریاستوں کے لئے بھی آئین سازی میں شمولیت کے لئے گنجائش پیدا کی جائے گی۔ برطانوی حکومت اس آئین کے مکمل ہوتے ہی اسے نافذ العمل قرار دے دے گی۔ شرط یہ ہو گی کہ وہ صوبہ جو اس نئے آئین کو قبول کرنے کے لئے تیار نہ ہو اپنی پہلے کی آئینی حیثیت کو برقرار رکھنے کا مجاز ہو گا۔ اور اگر بعد میں وہ برصغیر کے آئین میں شریک ہونا چاہے تو اس کے لئے بھی گنجائش رکھی جائے گی برصغیر کے وائسرائے لارڈ لنلتھ گو (Linlithgow) اور کرپس کے درمیان اعتماد کا فقدان تھا۔ کرپس کی برصغیر کے دفاع کا قلمدان برصغیر کے نمائندے کے حوالے کرنے کی تجویز وائسرائے کے لئے قابل قبول نہ تھی۔

——— اپنی آمد کے ایک ہفتہ بعد ہی کرپس کو یہ معلوم ہو گیا تھا کہ اس کا مشن
ا ہو گیا ہے۔ اس کی واپسی خاص طور پر وائسرائے کے لئے باعث اطمینان تھی۔
لہ وائسرائے' برصغیر کی انگریز انتظامیہ اور کانگریسی زعماء بھی کرپس کے رویئے کے
ن محتاط تھے۔ کرپس کی ناکامی کی بڑی وجہ کانگریس کا وہ عزم تھا جو اگست 1942ء میں
ر کی جانے والی "انڈیا چھوڑ دو" کی قرار داد سے ظاہر تھا۔ مہاتما گاندھی کا یہ خیال تھا
انگریز جنگ نہیں جیت سکیں گے۔ ان پر دباؤ بڑھانے کی غرض سے یہ قرار داد منظور
ئی۔ اور کرپس کی پیش کش کو دیوالیہ ہونے والے بینک کے لئے بعد از تاریخ پیش کیا
ے والا چیک کہہ کر مسترد کر دیا گیا۔ مہاتما گاندھی مطلق العنان حکمران کی طرح
لیں پر حکومت کر رہے تھے ان کی اجازت کے بغیر کوئی اقدام کرنا کانگریسی زعماء کے
ی بات نہ تھی۔ مولانا آزاد کے کہنے کے مطابق سردار ولبھ بھائی پٹیل نے ایک بار
ے گستاخی بھی کی تھی۔ ان کے متعلق کچھ ایسے الفاظ ادا کئے تھے جو کسی اور کی زبان
ں نہ آ سکتے تھے ———

جاپان کے پرل ہاربر پر حملے نے امریکہ کو بھی جنگ میں دھکیل دیا۔ جاپان کی پیش
ا جاری تھی۔ امریکہ اور برطانیہ اس پیش قدمی سے پریشان تھے۔ روز ویلٹ جو
ہ کے صدر تھے کی برطانیہ کے وزیر اعظم ونسٹن چرچل سے بحر اوقیانوس میں ایک
ا جہاز پر ملاقات ہوئی۔ امریکی صدر نے برصغیر کے راہنماؤں کی خوشنودی اور ان کا
ن حاصل کرنے کے لئے چرچل پر دباؤ ڈالا۔ قائداعظم کے لئے یہ کڑی آزمائش کا
، تھا۔ نئے انتخابات نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ مسلمانوں کی نمائندگی صرف مسلم لیگ
، سکتی تھی۔ قائداعظم کو یہ خدشہ تھا کہ کہیں برطانیہ امریکی دباؤ کے تحت کانگریسی زعما
ایسا کوئی سمجھوتا نہ کر لے جس سے مسلمانوں کے مفاد کو نقصان پہنچے۔ وہ جنگ کے
، میں برطانیہ کو اپنے تعاون کا یقین بھی دلاتے رہے اور اس کے کردار کی نگہداری
کرتے رہے۔ کرپس نے تجویز دی۔

——— کہ جنگ کے بعد ——— ایک یا ایک سے زائد نو آبادیات کی صورت میں
غیر کو آزادی دے دی جائے گی (ایک سے زیادہ اس صورت میں جب وہ صوبے جو
برصغیر کے آئین کو تسلیم نہ کرتے ہوئے اپنا الگ آئین بنانا پسند کریں)

——— سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کو وائسرائے کی کاونسل میں فوری طور پر شامل کرنے کی پیش کش بھی کی گئی شرط یہ تھی کہ تجویز کے دونوں حصے بیک وقت منظور کئے جائیں گے اور مسترد کئے جانے کی صورت میں دونوں مسترد کئے جائیں گے۔ ایک منظور اور ایک نامنظور نہیں ہو سکے گا۔ مزید برآں اس تجویز پر عمل اسی صورت میں ہو سکے گا جب مسلم لیگ اور کانگریس دونوں راضی ہو جائیں۔

جنگ کے اختتام پر برصغیر کی آزادی کے طریق کار کا بھی اعلان کیا گیا۔

——— تمام صوبوں میں انتخابات کرانے کا وعدہ کیا گیا۔

——— صوبائی اسمبلیوں کے اراکین کی رائے سے دستور ساز مجلس کا قیام عمل میں آئے گا۔

——— ہر صوبے میں استصواب کا انعقاد ہو گا اور ہر صوبے کے باشندے انڈین یونین میں شمولیت یا عدم شمولیت کا فیصلہ کریں گے۔

——— وہ صوبہ جو انڈین یونین میں شامل نہ ہونے کا فیصلہ کرلے اسے اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا مکمل اختیار ہو گا۔

——— جنگ کے دوران برصغیر کے دفاع کی تمام ذمہ داری برطانیہ کی ہو گی۔ وائسرائے کی کاونسل میں سیاسی جماعتوں کے نمائندوں کی موجودگی کے باوجود دفاع کا محکمہ انگریز ہی کے پاس رہے گا ———

کانگریس تو اس خوش فہمی میں مبتلا تھی کہ انگریز شکست کھا رہا ہے۔ کسی ہار جانے والے سے مفاہمت مناسب نہیں۔ مسلم لیگ نے کرپس کے پلان کی روح کو مدنظر رکھا۔ پلان دونوں جماعتوں نے مسترد کر دیا۔ مسلم لیگ نے کرپس کی تجویز کا حوالہ دیتے ہوئے مرکز میں کثرت رائے کے فیصلے پر تنقید کی اور کہا کہ اسمبلی میں مسلمانوں کا تناسب تو صرف 25 فیصد ہو گا۔ ان حالات مسلمان کسی انڈین یونین میں مستقل اقلیت بن کے رہنے کے لئے تیار نہیں۔ اور پھر یہ کہ مسلم لیگ کا نصب العین پاکستان ہے۔ وہ پاکستان سے کم کسی چیز کو قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔

کرپس کا مشن تو کامیاب نہیں ہو سکا اور اس کی سب سے بڑی وجہ کانگریس کا یہ یقین تھا کہ انگریز جنگ میں شکست کھا جائے گا اس سے کسی قسم کی مفاہمت نامناسب

ہے۔ مشن مسلم لیگ کے نظریہ کو تو تسلیم نہیں کر سکا۔ مگر اس کی بنیاد مسلم لیگ کے طالبہ سے مطابقت ضرور رکھتی تھی۔ اور کانگریس کے بہت سے زعما نے یہ محسوس کرنا شروع کر دیا کہ مسلمانوں کو اعتماد میں لئے بغیر برصغیر کا کوئی مسئلہ حل نہیں ہو گا۔

مہاتما گاندھی نے قرارداد پاکستان کی منظوری کے کچھ دیر بعد اپنے ایک مضمون میں ا کہ انہیں کسی صورت یہ یقین نہیں آتا کہ پاکستان کے آٹھ کروڑ مسلمان یہ اعتراف کر ں گے کہ ان میں اور ہندوؤں میں کوئی قدر کوئی چیز مشترک نہیں۔ ان کے خیالات کا رازہ تو اس ضمن میں منعقد کئے جانے والے استصواب ہی سے ہو سکتا ہے۔ مجھے تصواب کے علاوہ مسلمانوں کی رائے معلوم کرنے کا اور کوئی طریقہ نظر نہیں آتا گاندھی ی کا یہ اعلان مسلم لیگ کی قیادت کے لئے ایک چیلنج تھا۔ سینتیس کے انتخابات میں مسلم ے کی کارکردگی مایوس کن رہی تھی۔ مسلم لیگ ان علاقوں میں بھی خاطر خواہ حمایت صل نہ کر سکی قرارداد پاکستان میں جنہیں مسلم اکثریت کے علاقے قرار دیا گیا تھا۔ نگریسی زعما برصغیر میں عام طور پر دو مستند قوتوں کا ذکر کیا کرتے تھے۔ ایک انگریز اور سری کانگریس قائداعظم نے 1937ء میں اس تیسری قوت کا اعلان بھی کیا تھا جو انگریزوں ر کانگریس کے علاوہ سیاست میں موجود تھی۔ ان کے دعوے کو مجذوب کی بڑ سے زیادہ بت نہیں دی گئی تھی۔ اور کانگریس کی طرف سے اس دعوے کی حقیقت سے انکار ہی 19ء کی شملہ کانفرنس کی ناکامی کی سب سے بڑی وجہ تھی۔

اس کانفرنس کی ناکامی کے بعد قائداعظم نے برصغیر میں انتخابات کے انعقاد کا البہ کیا۔ اور چونکہ عام مسلمانوں کی رائے کے تعین کے بغیر برصغیر کے سیاسی مسئلے کا ا ممکن نہیں تھا۔ انگریز سرکار نے 46-1945ء میں الیکشنوں کا اعلان کر دیا۔ لیگ کی ت کے لئے کانگریس نے بہت کچھ کیا۔ سردار ولبھ بھائی پٹیل کو مسلمان صوبوں میں نے والے انتخابات کا نگران مقرر کیا گیا۔ پروفیسر شریف المجاہد کے کہنے کے مطابق وں نے مسلم لیگ کی مخالف تمام مسلمان جماعتوں کو متحد کرنے کا اہتمام کیا۔ جمعیت ئے ہند۔ آل انڈیا مسلم مجلس۔ آزاد مسلم بورڈ' آل انڈیا شیعہ پولیٹیکل کانفرنس' یوپی کا ومن سنت بورڈ' بہار کی مومن کانفرنس سرحد کے خدائی خدمت گار' بلوچستان کی انجمن وطن' مجلس احرار اور خاکسار سب کے سب مسلم لیگ کی مخالفت کے لئے تل گئے۔

پنجاب میں خضر حیات ٹوانہ کی یونینسٹ پارٹی اور سندھ میں جی ایم سید کی ترقی پسند مسلم لیگ کو بھی کانگریس کی مکمل اعانت حاصل تھی۔ ان مختلف تنظیموں میں ہم ربطی پیدا کرنے کی ذمہ داری مولانا آزاد کو دی گئی۔ انہوں نے دہلی میں ستمبر 1945ء میں نیشنل مسلم کانفرنس کا اجلاس طلب کیا اور ایک آزاد مسلم پارلیمنٹری بورڈ قائم کر دیا گیا۔ پنجاب اور بنگال کو خصوصی توجہ کا مستحق سمجھا گیا۔ پنجاب کانگریس کمیٹی کے صدر مولانا داؤد غزنوی کو حالات پر قابو پانے کے لئے چھ لاکھ روپے دیئے گئے پانچ لاکھ مزید ھیم سین سچر کو ملے۔ انہیں بھی پنجاب میں مسلم لیگ کی شکست کے لئے یہ رقم فراہم کی گئی۔ سردار پٹیل نے بنگال کے بی سی رائے کو ڈیڑھ لاکھ بھجوائے اور مزید ضروریات کے لئے انہیں ہندو کروڑ پتی صنعتکار سی ڈی برلا سے درخواست کرنے کی ہدایت کی گئی۔

بنگال، پنجاب اور سندھ میں مختلف مسلمان دھڑے آپس میں الجھ رہے تھے۔ بنگال میں خواجہ ناظم الدین اور حسین شہید سہروردی ایک دوسرے کے خلاف نبرد آزما تھے۔ سندھ میں جی ایم سید کے نامزد کردہ تمام امیدواروں کو لیگ کا ٹکٹ نہ ملنے پر جی ایم سید ناراض ہو گئے۔ سر غلام حسین ہدایت اللہ کھوڑو اور سید ایک دوسرے کے خلاف برسرپیکار تھے۔ پنجاب وزارت یونینسٹوں کی تھی۔ سرحد میں کانگریس کے ڈاکٹر خانصاحب وزیراعلیٰ تھے۔ شملہ کانفرنس میں کانگریس کی ہٹ دھرمی نے اس کے مسلمان بہی خواہوں کو اس سے بدظن ضرور کر دیا تھا۔ اور وہ یہ سوچنے پر مجبور ہو گئے تھے کہ کانگریس کو مسلمانوں کے مستقبل سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اس کی سوچ محض ہندوؤں کے لئے ہے۔ پنجاب سے میاں افتخار الدین، سر فیروز خاں نون، میجر ممتاز ٹوانہ اور بیگم جہاں آراء شاہنواز مسلم لیگ میں شامل ہو گئے تھے۔ اس کے باوجود حالات سازگار نہ تھے۔ فرنٹیئر میں بخت جمال خاں اور اورنگ زیب خاں کی چپقلش عروج پر تھی۔ بنگال میں خواجہ ناظم الدین کی اپارٹمنٹ نے حالات کو سنبھال لیا تھا۔ مسلمان علماء کا احترام کرتے تھے۔ جمعیت علمائے ہند کانگریس نواز مسلک لئے ہوئے تھی۔ مسلمان علماء کی اس کانگریس نواز جماعت کے مقابلے میں مولانا شبیر احمد عثمانی نے جمعیت علمائے اسلام کی بنیاد رکھی مولانا نے عمر رسیدہ ہونے کے باوجود تحریک پاکستان کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا۔ مولانا نے میرٹھ، لاہور، کلکتہ اور بمبئی میں مسلمانوں کے اجتماعات سے خطاب کر کے انہیں مسلم

لیگ کی حمایت کرنے کی تلقین کی۔ جمعیت علمائے ہند کے مقابلے میں مولانا عثمانی کا کردار تحریک پاکستان میں سنگ میل ثابت ہوا۔

مسلم لیگ کو الیکشنوں کے سلسلے میں بہت سی مشکلات کا سامنا تھا۔ ایک تو اس کے پاس سرمایہ نہیں تھا۔ پھر ووٹروں کو پولنگ اسٹیشنوں تک پہنچانے کے لئے گاڑیاں نہیں تھیں۔ آپس کی گروہ بندیاں بھی نقل و حرکت پر پابندیاں لگائے ہوئے تھیں قائداعظم کے ووٹروں کو احکام یہ تھے کہ انہیں ہر طور ووٹ ڈالنے کی غرض سے پولنگ بوتھوں پر جانا ہے۔ انہیں اس کے لئے دس بیس میل پیدل بھی چلنا پڑے تو ان کو اعتراض نہیں ہونا چاہیے۔ اور ہوا بھی یونہی۔ مسلمان گھروں سے نکلے اور انہوں نے مسلم لیگ کے حق میں ووٹ دے کر یہ ثابت کر دیا کہ مسلم لیگ ہی ان کی واحد نمائندہ جماعت ہے اور لیگ کا پروگرام ان کا پروگرام ہے۔

الیکشن ہوئے۔ قائداعظم اور لیگ کے خلاف جمعیت علمائے ہند اور کانگریس کا زہریلا پراپیگنڈا ناکام ہو گیا۔ برلا اور کلکتہ کے ایوان صنعت و تجارت کی طرف سے خرچ کی جانے والی رقوم اکارت گئیں۔ مولانا داؤد غزنوی اور ھیم سین سچر کو سردار ولبھ بھائی پٹیل کی طرف سے دیئے جانے والے روپے بھی کسی کام نہ آئے۔ لیگ نے مرکز میں تیس کی تیس مسلمان نشستیں جیت لیں۔ ان میں سے ایک بھی کانگریس یا مسلم لیگ مخالف کسی اور سیاسی جماعت کو نہ مل سکی۔ بنگال میں 121 نشستوں میں سے 115 لیگ نے حاصل کر لیں۔ یعنی 95 فیصد نشستیں حاصل کیں۔ فرنٹیئر میں مسلم لیگ کو اڑتیس میں سے سترہ سیٹیں ملیں۔ پنجاب میں مسلم لیگ کو 75 نشستیں مل گئیں —— کامیابی کا تناسب 87 فیصد رہا۔ مسلم اقلیت کے صوبوں میں لیگ کی فتح حیران کن تھی۔ ان صوبوں کے مسلمانوں نے یہ جانتے ہوئے کہ پاکستان میں ان کے علاقوں کی شمولیت کا کوئی امکان نہیں ووٹ مسلم لیگ کو دیئے۔ آسام میں مسلم لیگ نے اکانوے فیصد مسلمان نشستیں حاصل کر لیں۔ بہار میں کامیابی کا تناسب 85 فیصد رہا۔ یو پی میں 82 فیصد۔ سی پی میں 93 فیصد اور اڑیسہ میں 100 فیصد رہا۔ مسلم لیگ نے صوبائی اور مرکزی نشستوں میں سے 86.45 فیصد کامیابی حاصل کی۔ ان دنوں برصغیر میں مسلمانوں کی آبادی کل آبادی کا 26.4 فیصد تھی۔ اور لیگ کو 24 فیصد ووٹ حاصل ہوئے۔ یہ وہ الیکشن تھے جنہوں نے قیام

پاکستان کی راہ ہموار کی۔ کانگریس اور مسلم لیگ کے دوسرے مخالفین کے دعوے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ مہاتما گاندھی کو اپنے چیلنج کا جواب مل گیا۔ مسلمان اکثریت کے صوبے تو الگ رہے اقلیت کے صوبوں نے بھی لیگ کے ایجنڈے کی تائید کرتے ہوئے پاکستان کے مطالبے کو برملا انداز سے تسلیم کر کے یہ ثابت کر دیا کہ ایک علیحدہ خود مختار ریاست مسلمانان برصغیر کا نصب العین ہے۔ برصغیر کے حالات میں ابتری کے آثار نمایاں ہو رہے تھے۔ فروری 1946ء میں ہندوستانی بحریہ میں بغاوت ہو گئی۔ باغی افسروں اور جوانوں نے بحریہ کے انگریز کمانڈر کنگ کو مورد الزام ٹھہرایا ـــــــ فضائیہ کے اڈوں پر بھی ہڑتالیں ہوئیں۔ اور بریہ میں بھی بے چینی کے آثار نظر آنے لگے۔ لال قلعہ میں ہندوستان کی فوج کے ان افسروں کے خلاف مقدمہ چل رہا تھا جنہوں نے جاپانیوں کے ساتھ مل کر سبھاش چندربوس کی قیادت میں انڈین نیشنل آرمی میں شمولیت اختیار کر کے انگریز کے خلاف بغاوت کی تھی۔ برصغیر کے رہنے والے انہیں ہیرو سمجھتے تھے۔ انگریز کی نگاہوں میں وہ غدار تھے اور کانگریس اور مسلم لیگ دونوں ان افسروں کی حمایت کر رہی تھیں۔ برصغیر میں انگریز کی فوجی قیادت ان حالات کے پیش نظر پریشان سی تھی۔ انہیں خدشہ تھا کہ ہندوستانی فوج وفاداریاں تبدیل کر کے ان کے خلاف اٹھ کھڑی ہو گی۔ دوسری جنگ عظیم میں ہندوستانی فوج کی ساخت تبدیل ہو گئی تھی۔ ہندوستانی فوج کے افسر بن گئے تھے۔ مسلمان اور سکھ تو خیر دلیر جنگجو اور شجاع اقوام متصور ہوتی تھیں۔ چونکہ افرادی قوت کی کمی تھی اس لئے جنوب اور شمال سے ہندوؤں کو بھی شاہی کمیشن کے لئے منتخب کر لیا گیا تھا۔

انگریز نے برصغیر سے نکالے جانے پر نکل جانے کو ترجیح دی۔ انگریز جنگ تو جیت گیا تھا۔ مگر فتح حاصل کرنے کے بعد بھی اس کی حالت شکست خوردہ غنیم سے بہتر نہ تھی۔ چرچل کی حکومت جنگ کے بعد ہونے والے انتخابات میں شکست کھا گئی تھی۔ برطانیہ میں لیبر پارٹی نے ایٹلی کی قیادت میں حکومت سنبھال لی تھی۔ اور لیبر پارٹی کے پنڈت نہرو سے گہرے تعلقات تھے۔ ان تعلقات کو بہتر بنانے کے لئے کانگریس نے اپنے نمائندے انگلستان بھجوا رکھے تھے۔ سدھیر گھوش جس کا ذکر پہلے آ چکا ہے۔ ان میں سے ایک تھا۔ کرشنا مینن بھی انگلستان ہی میں تھے۔ یہ اور ان کے علاوہ دوسرے جو وہاں مقیم تھے یا

جنہیں خاص مقاصد کے لئے وہاں بھیجا جاتا تھا ارباب اقتدار سے ملتے رہتے تھے۔ ان سے تعلقات استوار کرنے کے بعد ان کے خیالات پر اثر انداز ہوتے رہتے تھے۔ ان کا اصل مقصد تھا برطانیہ کے ارباب اقتدار کی کانگریس اور کانگریس کی پالیسیوں کے لئے حمایت حاصل کرنا۔ اور وہ اپنے ان مقاصد میں کامیاب تھے ـــــــ

برطانیہ کے وزیراعظم ایٹلی نے 19 فروری 1946ء کو برصغیر میں ایک مشن بھیجنے کا اعلان کیا۔ اور یہ بھی کہہ دیا کہ اقلیت کو اکثریت کی ترقی کو ویٹو کرنے کا اختیار نہیں دیا جا سکتا۔ بات صاف تھی۔ دھمکی مسلم لیگ اور مسلمانوں کے لئے تھی۔ حوصلہ افزائی کی گئی تھی کانگریس اور ہندو اکثریت کی۔ قائداعظم نے اس تہدید کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ یہ تو عنکبوت (مکڑی کا جالا) اور مکھی کی بات ہے۔ جولاہک (مکڑی) اگر مکھی کو جالے میں آنے کی دعوت دے اور مکھی اس کے جال میں پھنسنے سے انکار کر دے تو اسے اقلیت کی طرف سے اکثریت کی ترقی پر ویٹو نہیں قرار دیا جا سکتا۔

ایٹلی کے اس اعلان سے انگریز کے ارادوں کی نشاندہی ہو رہی تھی۔ لارڈ پیتھک لارنس جو ایٹلی کی کابینہ میں سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا تھے۔ سر سٹیفورڈ کرپس (Stafford Cripps) اور جناب اے وی الیگزانڈر کی معیت میں برصغیر کی سیاسی گتھیاں سلجھانے کے لئے ہندوستان آئے۔ ان کا اصل مقصد تو برصغیر میں یکجہتی کو برقرار رکھنا تھا۔ انہوں نے جو تجویز پیش کی اس میں یہی کہا گیا کہ برطانوی ہندوستان اور ہندوستانی ریاستوں پر مشتمل برصغیر کی ایک یونین قائم کی جائے۔ امور خارجہ دفاع، مواصلات اور ان کے لئے ضروری فنانس پیدا کرنے کے لئے تمام اختیارات مرکز کے پاس ہوں گے۔ وہ مسائل جن کا تعلق فرقہ واریت سے ہو گا ہندوؤں اور مسلمانوں کے نمائندوں کی اکثریت سے طے کئے جائیں گے۔ صوبوں کے تین گروپ تشکیل دیئے جائیں گے۔ پہلا ان صوبوں پر مشتمل ہو گا جہاں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ دوسرے گروپ میں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان شامل ہوں گے۔ اور تیسرا بنگال اور آسام پر مشتمل ہو گا۔ نئی دستور ساز اسمبلی میں ہر صوبے کے نمائندوں کی تعداد اس کی آبادی پر منحصر ہو گی۔ ہندو مسلمان اور سکھ اپنے اپنے نمائندوں کو منتخب کر سکیں گے دستور ساز اسمبلی میں موجود مختلف گروپوں کے نمائندے اپنے صوبوں کا دستور بھی تشکیل کریں

گے۔ صوبوں کی نئی اسمبلیاں پہلے عام انتخابات کے بعد گروپ کے ساتھ رہنے یا نہ رہنے کا فیصلہ کر سکیں گے۔ کیبنٹ مشن نے عبوری حکومت کے قیام پر بھی زور دیا اور یہ اعلان کر دیا کہ وزارت دفاع کا سربراہ بھی ہندوستانی ہو گا۔

قائداعظم اس افسوس کا اظہار کرتے ہوئے کہ کیبنٹ مشن نے آزاد خود مختار پاکستان کے قیام کو نامنظور کرتے ہوئے جو تجاویز پیش کی ہیں ان کے ابہام کو دور کرنے کے لئے وضاحتوں کی ضرورت ہے۔ وضاحتیں اور یقین دہانیاں مل جانے پر مسلم لیگ کاؤنسل کی میٹنگ طلب کی گئی۔ کاؤنسل کے اراکین کو پاکستان کا مطالبہ مسترد ہو جانے کا دکھ تو تھا اس کے باوجود انہوں نے برصغیر کے عوام کی خوشحالی کو مد نظر رکھتے ہوئے اور اسی خیال کے پیش نظر کہ تجویز میں مستقبل کے پاکستان کا ڈھانچہ موجود ہے تجویز قبول کر لی۔

کانگریس نے جب یہ دیکھا کہ مسلم لیگ نے تجویز منظور کر لی ہے تو انہوں نے تجویز کو اپنی خیالات کے مطابق ڈھالنے کے لئے کیبنٹ مشن کے ارکان پر دباؤ ڈالا۔ سدھیر گھوش سٹیفورڈ کرپس سے ملے۔ عبوری حکومت کے متعلق کچھ مطالبات منوانے کی کوشش کی گئی۔ وائسرائے نے قائداعظم کو یہ یقین دلایا تھا کہ عبوری حکومت کے بارہ رکن ہوں گے ان میں سے پانچ مسلم لیگ نامزد کرے گی۔ پانچ کانگریس۔ ایک سکھ ہو گا اور ایک اینگلو انڈین۔ کانگریس کو یہ انتظام کسی صورت پسند نہ تھا۔ وہ لیگ کو اپنے برابر اہمیت دینے کے لئے تیار نہ تھی۔ مہاتما گاندھی نے قوم پرست مسلمانوں کی نامزدگی کا سوال اٹھایا۔ کیبنٹ مشن پر دباؤ بڑھا۔ انہوں نے اراکین کی تعداد بارہ سے بڑھا کر چودہ کر دی چھ رکن کانگریس کو نامزد کرنے کی اجازت دے دی گئی۔ مسلم لیگ کے پاس پانچ رہ گئے۔ کانگریس کے لئے یہ کامیابی بھی سدھیر گھوش نے سٹیفورڈ کرپس کی وساطت سے حاصل کی۔ سدھیر گھوش نے مہاتما گاندھی کو سٹیفورڈ کرپس سے اپنی خفیہ گفت و شنید کی اطلاع دیتے ہوئے بتایا کہ کانگریس کے طویل المیعاد منصوبے کے قبول کر لینے اور عبوری حکومت کے منصوبے کو مسترد کر دینے پر موخر الذکر پلان منسوخ کر دیا جائے گا اور اس کے لئے نئی تجاویز پیش کی جائیں گی۔

اور یوں ہی کیا گیا۔ طویل میعاد کا منصوبہ منظور کر کے عبوری حکومت کا منصوبہ مسترد کر دیا گیا۔ اور طویل مدت کے منصوبے کو بھی اپنی شرائط سے منسلک کر دیا گیا۔

کانگریس کی شرائط نے کیبنٹ مشن کے منصوبے کی شکل ہی مسخ کر دی لیگ نے مرکز کے محدود اختیارات کے ساتھ صوبائی گروپوں کی تجویز قبول کی تھی۔ ان عناصر کے اخراج سے پلان کیبنٹ مشن کا نہیں رہا تھا۔ بلکہ برصغیر میں ہندو کی بالادستی کے قیام کی غرض سے کانگریس کا پلان معلوم ہونے لگا تھا۔ انگریز نے ایک بار پھر کانگریس نوازی کا ثبوت دیتے ہوئے کانگریس کے عبوری حکومت کے منصوبے کو مسترد کرنے کا اعلان از خود تبدیل کر کے یہ کہہ دیا کہ کانگریس نے یہ تجویز بھی منظور کر لی ہے۔ یہ سب کچھ لوگوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے مترادف تھا۔ حقیقت تو یہ تھی کہ مسلم لیگ نے دونوں منصوبے قبول کر لئے تھے اور کانگریس نے ایک کے ساتھ اپنی شرائط منسلک کر دی تھیں اور دوسرا یکسر مسترد کر دیا تھا ——

—— کیبنٹ مشن اور وائسرائے نے اپنا موقف دس ہی دن میں تبدیل کر لینے کوئی خفت محسوس نہیں کی۔ انگریز کی مسلمانوں سے بیزاری کا یہ عالم تھا کہ مولانا آزاد پر بھی ان کے کانگریس کا صدر ہونے کے باوجود مکمل اعتماد نہ تھا۔ انہوں نے بات طے کی تو گاندھی جی اور سردار پٹیل سے۔ مولانا آزاد (جو چودھری محمد علی کے کہنے کے مطابق کیبنٹ مشن کی تجاویز کے حق میں تھے) مسلمان ہونے کی بنا پر اعتماد کے قابل نہ سمجھے گئے۔ پنڈت نہرو کے کانگریس کے صدر کا عہدہ سنبھالنے پر کیبنٹ مشن اور کانگریس کے درمیان طے پا جانے والے وہ تمام امور مسلم لیگ جن سے باخبر نہ تھی طشت ازبام ہو گئے۔ پنڈت نہرو نے اپنی ایک پریس کانفرنس میں واشگاف الفاظ میں یہ اعلان کر دیا کہ کانگریس کی دستور ساز اسمبلی میں شمولیت شرائط کے ماتحت ہیں۔ اور تمام معاہدوں سے آزاد ہو گی۔ ان سے جب یہ پوچھا کہ کیا کیبنٹ مشن کے پلان میں تعدیل ممکن ہے۔ انہوں نے جواب دیا کہ کانگریس نے محض دستور ساز اسمبلی میں شرکت کا وعدہ کیا ہے اور کانگریس کو کیبنٹ مشن کی تجاویز میں تعدیل اور تغیر کا مکمل اختیار ہے۔ انہوں نے مزید کہا کہ صوبوں کی گروپ بندی نہیں ہو گی —— اول تو ہندو اکثریت کے صوبے اس کی مخالفت کریں گے۔ دوسرے گروپ میں صوبہ سرحد کی طرف سے مخالفت کی جائے گی اور تیسرے گروپ میں آسام اس گروپ بندی میں شریک نہیں ہو گا۔ پنڈت نہرو کا بیان ان تمام اصولوں کی تردید تھی جن پر کیبنٹ مشن نے اپنی تجاویز کی بنیاد رکھی تھی۔ قائداعظم

نے احتجاج کیا اور برطانوی حکومت سے اس ابہام کو دور کرنے کے لئے کہا۔ برطانوی حکومت نے پنڈت نہرو کے بیان کی تردید مناسب نہیں سمجھی۔ یہ کہنے پر اکتفا کیا کہ تجاویز کو قبول کر لینے کے بعد کسی کو ان میں ردوبدل کا حق نہیں۔ وہ اپنے بیانات میں اپنے موقف کا اظہار کرتا رہے۔ برطانوی حکومت کو اس سے سروکار نہیں۔ برطانوی حکومت نے معاملے کو سلجھانے کے لئے حقیقت بیانی سے گریز کیا۔ مسلم لیگ کے پاس ان بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر کیبنٹ مشن کی تجاویز کو منظور کرنے والی قرارداد کی تنسیخ کے علاوہ اور کوئی چارۂ کار نہ تھا۔ مسلمانوں کو ایک بار پھر فریب دینے کی مذموم کوشش کی گئی۔ راز جلد ہی کھل گیا۔ یہاں پنڈت نہرو نے بھانڈا پھوڑ دیا ——— اس کے بعد یہ کام سردار پٹیل نے اپنے ذمہ لے لیا۔ اور ان خفیہ سازشوں کو آشکار کرتے رہے جو انہوں نے انگریز کے ساتھ مل کے مسلمانوں کے خلاف کیں۔

——— مگر سب سے اہم کردار سدھیر گھوش کا ہے۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی کارگزاری کرشنا مینن اور وی پی مینن کی کارگزاری سے زیادہ اہم تھی۔ وہ جب بھی کانگریس یا مہاتما گاندھی کی طرف سے سفارتی امور کے لئے نکلے کامیاب لوٹے۔ ان کے پاس نجانے کس قسم کا جادو تھا۔ ان کی شخصیت میں نجانے کیسی مقناطیسیت تھی کہ وہ کبھی ناکام نہیں ہوئے۔ جس مقصد کے لئے انہیں بھیجا گیا۔ وہ اس مقصد کو حاصل کر کے لوٹے۔ یہ معلوم نہیں کہ انہوں نے برطانیہ کے ارباب اقتدار کا قرب کیونکر حاصل کیا۔ ان کے پاس ایسی کون سی چیز تھی جس نے انہیں اس قدر بارسوخ بنا دیا کہ انہوں نے جو بھی طلب کیا۔ جب بھی طلب کیا۔ انہیں مل گیا۔ کرشنا مینن کا رسوخ بھی کچھ کم نہ تھا۔ اور وی پی مینن کے متعلق تو یہ کہا جاتا ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن ان کی بات کبھی نہ ٹالتے تھے۔ ان کے انگریز سٹاف نے وی پی مینن کی موجودگی پر اعتراض بھی کیا۔ کہا اس کے یہاں ہونے سے قسم قسم کی افواہیں پھیلیں گی۔ اس کے آپ سے اور کانگریسی زعما سے گہرے مراسم کا لوگوں کو علم ہے۔ مگر ماؤنٹ بیٹن نے اپنے سٹاف کے اعتراض پر توجہ نہیں دی۔

عائشہ جلال نے (The Sole Spokesman) دی سول سپوکس مین کے نام سے تحریک پاکستان اور قائداعظم پر ایک کتاب لکھی ہے۔ کتاب کے نام اور اس کے

مندرجات سے یہ تاثر ملتا ہے کہ قائداعظم کو طنز کا ہدف بنایا گیا ہے اور شاید یہ کہنے کی کوشش کی گئی ہے کہ قائداعظم نے اپنے آپ کو برصغیر کے مسلمانوں کا واحد ترجمان کہلوانے کے لئے پاکستان کی تحریک کی سرپرستی فرمائی۔ کیبنٹ مشن سے متعلق ان کی تحریر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کے خضرحیات سندھ کے جی ایم سید۔ فرنٹیئر کے ڈاکٹر خانصاحب اور بنگال کے سہروردی نے قائداعظم کی مخالفت کی اور کیبنٹ مشن سے اپنی ملاقاتوں میں پاکستان کی تائید نہیں کی بلکہ اس کے خلاف ہرزہ سرائی کی۔ کیبنٹ مشن نے مسلمان اکثریت کے ان صوبوں کے قائدین کے خیالات سن کر یہ اندازہ کیا کہ برصغیر کے مسلمان پاکستان کے نعرے کو اپنے لئے زیادہ مراعات حاصل کرنے کی غرض سے استعمال کر رہے ہیں۔ اس کے حصول کے لئے سنجیدہ نہیں۔ اکثریتی صوبوں کے یہ مسلمان زعماء جنہوں نے قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو ترجیح دی مسلمان اکثریت کے ان صوبوں کی تقسیم کے ذمہ دار ہیں جس کی بنا پر قائداعظم کو مقطوع اور کرم خوردہ پاکستان قبول کرنا پڑا۔ نادانستہ طور پر یہ بھی اس سازش کا حصہ بن گئے جو پاکستان کو نرغے میں لے کر ختم کر دینے کے لئے کی گئی تھی۔

انگریزی راج کے لئے سکھوں کی خدمات کا برطانوی سرکار کو علم تھا۔ انہیں کانگریس نے اپنے اغراض و مقاصد کے لئے استعمال کیا۔ ان سے یہ کہلوایا گیا کہ صوبائی گروہ بندی ان کے مفاد میں نہیں۔ ان کے کہنے کے مطابق گروپ "بی" میں جہاں پنجاب، سرحد، سندھ اور بلوچستان کی گروہ بندی تجویز کی گئی تھی مسلمان اکثریت کی بالادستی کو مستقل کر دیا گیا ہے اور سکھ اقلیت کبھی اس سے نجات حاصل نہ کر سکے گی۔ انگریز ان کی خوشنودی ضرور حاصل کرنا چاہتے تھے مگر ا حقائق کچھ ایسے تھے کہ ان کے لئے ان کی مرضی کے مطابق کوئی انتظام ممکن نہ تھا۔ قائداعظم کی یقین دہانیوں کے باوجود ان کے قائدین نے کانگریس کا اتحادی بن کے مسلم لیگ کے خلاف محاذ قائم کیا۔ کانگریس نے انہیں مسلمانوں کے خلاف استعمال کر لینے کے بعد ان سے کئے جانے والے تمام وعدے فراموش کر دیئے۔ 1961ء میں جب پنجابی صوبہ کے لئے ان کی جدوجہد کو پنڈت نہرو نے سختی سے کچل دیا تو انہیں اس امر کا احساس ہوا کہ انہیں صرف مسلمان کے خلاف آلۂ کار کے طور پر اکسایا گیا تھا اور ماسٹر تارا سنگھ نے اس وقت یہ اعتراف کیا کہ

آزاد سکھ ریاست کا مطالبہ جو مسلمانوں کے پاکستان کے مطالبے کے مقابلے میں کیا گیا تھا ان کا اپنا نہیں تھا۔ انہیں اس مطالبے کے لئے کانگریس نے اکسایا تھا۔ اور سننے میں آیا ہے کہ ماسٹر تارا سنگھ نے قیام پاکستان کے بعد حسن ابدال میں ایک تقریر کے دوران رو پڑے اور مسلم لیگ کے خلاف کانگریس کی اعانت کرنے کی غلطی کا بھری محفل میں اعلان کرکے شرمندگی اور پشیمانی کا اعتراف کیا۔ سکھوں کی قومیت کا مسئلہ ابھی تک حل نہیں ہو سکا۔ پنجابی صوبہ بن گیا ہے۔ مگر وہاں بھی سکھ اپنے لئے وہ مقام حاصل نہیں کر سکے جس کا خواب انہوں نے آزادی کے وقت دیکھا تھا۔ ایک آزاد خود مختار وطن کے لئے ان کی مساعی کو بیدردی سے کچل دیا گیا۔ ہزاروں سکھ نوجوان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ ان کے مقدس مقامات کی بے حرمتی کی گئی۔ اور انہیں یہ باور کرا دیا گیا کہ وہ بھارت میں دوسرے درجے کے شہری ہیں۔ بھارت حقیقت میں ایک ہندو ریاست ہے۔ اس کا سیکولرزم محض دنیا کے دکھانے کو ہے۔ اس کی پلٹنوں کے نعرے ہندو دیو مالا سے متعلق ہیں۔ اس کی سرکاری تقاریب کا آغاز ہندو رسوم سے مطابقت رکھتا ہے۔ اس کا ہر اقدام اس کے کلچر کا مظہر ہے۔ مغرب اسے سیکولر جمہوریت اس لئے نہیں کہتا کہ وہ واقعی سیکولر جمہوریت ہے۔ یہ مغرب کا دوغلا پن ہے۔ یہ مغرب کی روئیت ہے۔ مغرب کا ضمیر تاجرانہ ہے۔ بھارت بہت بڑی منڈی ہے۔ اور پھر مغرب اسلام سے خائف ہے ——

مسلم لیگ نے کیبنٹ مشن کی تجویز مسترد کرتے ہوئے ایک اور قرارداد کے ذریعے 16 اگست کو راست اقدام کا اعلان بھی کیا تھا۔ 16 اگست کو کلکتہ کے علاوہ سارا برصغیر خاموش رہا۔ کلکتہ میں انتہائی سنگین قسم کے فسادات پھوٹ پڑے۔ ان دنوں بنگال میں سہروردی کی حکومت تھی۔ حکومت نے 16 اگست کو عام تعطیل کا فیصلہ کیا۔ ہندوؤں نے مسلم لیگ کی وزارت کے اس فیصلے کو برا منایا۔ مشرقی کمانڈ کے انچارج جنرل سر فرانس ٹکر (Tuker) کے مطابق اس وقت ہڑتالوں کی اجارہ داری کانگریس کے پاس تھی۔ مسلم لیگ کا یہ اعلان کانگریسی حقوق پر شب خون سمجھا گیا اور راست اقدام کی مخالفت کی گئی۔ کلکتہ میں جھگڑا شروع ہو گیا۔ اس سے پہلے ہندو مسلم فسادات میں اتنی جانوں کا اتلاف کبھی نہ ہوا تھا۔ تین دن میں ساڑھے چار سو سے اوپر لوگ مارے گئے —— سکھوں نے بھی ہندوؤں کا ساتھ دیا۔ مسلمانوں کا جانی نقصان بھی ہوا اور انہی کو ان اموات کے

لئے مطعون کیا گیا۔

قائداعظم نے ایک دن پہلے مسلمانوں کو پرامن رہنے کی تلقین کی تھی۔ مگر قائداعظم کو ان فسادات کے لئے برا بھلا کہا گیا۔ عبوری حکومت کے قیام کے لئے کانگریس کو دعوت دی گئی تھی۔ کانگریس نے پانچوں مسلم نشستوں کے لئے کانگریسی مسلمان نامزد کرنے کے ارادے کا اظہار کیا تھا۔ لارڈ ویول کو تین کے نام موصول ہو چکے تھے۔ اس نے باقی دو نشستوں کو خالی رکھنے کا ارادہ کیا۔ خیال یہ تھا کہ مسلم لیگ کی شمولیت کی صورت میں اس کے لئے کوئی جگہ مخصوص کر لی جائے۔ وائسرائے کو یہ علم نہ تھا کہ مسلم لیگ ٹکڑوں پر گزر اوقات کرنے والی جماعت نہیں۔ پہلے انہیں پانچ نشستوں کی پیش کش کی گئی تھی۔ پانچ سے کم وہ کسی صورت میں قبول نہ کرتی۔

لارڈ ویول نے کلکتہ کے حالات کا جائزہ لیا اور ان کی سنگینی دیکھ کر اس نتیجہ پر پہنچے کہ کانگریس اور لیگ کی مفاہمت کے بغیر برصغیر کے حالات کے سدھرنے کا امکان کم ہے۔ خطرہ خانہ جنگی کا تھا۔ انہوں نے کانگریس کو پھر سے قائل کرنے کی کوشش کی۔ مہاتما گاندھی اور پنڈت نہرو یہ سمجھے کہ ان پر دباؤ ڈالا جا رہا ہے۔ مہاتما گاندھی نے لارڈ ویول کو قانونی نکات سمجھانے کی کوشش کی۔ یہ نہیں کہ لارڈ ویول قانونی موشگافیوں سے آشنا نہیں تھے۔ مگر یہ ضرور ہے کہ مہاتما کی جا و بیجا موشگافیوں نے معاملات کو الجھا رکھا تھا اور ویول اس رویے سے بیزار تھے۔ ویول کی یہ بیزاری کانگریسی زعما کو بری معلوم ہوئی۔ یہ محسوس کیا گیا کہ وہ مسلم لیگ کی حمایت کر رہے ہیں۔ ان کے خلاف شکایت کی گئی —— اور برطانوی حکومت نے ان کے تبادل کا انتظام کرنے کے بعد انہیں برخاست کر دیا۔

حالات کا جائزہ لینے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کانگریس مسلم لیگ کو عبوری حکومت میں شامل کرنے سے احتراز کر رہی تھی۔ اسے یہ معلوم تھا کہ حکومت پر قابض ہونے کی صورت میں حاکموں کو جو فوائد حاصل ہوتے ہیں وہ ان لوگوں کو نہیں ملتے جو حکومت میں شریک نہیں ہوتے۔ محسوس یوں بھی ہوتا ہے کہ کانگریس اس سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتی تھی۔ اسے یہ احساس تھا کہ ان حالات میں فوج اس کی ہو گی۔ فوج کو استعمال کرنے کا اختیار اس کے پاس ہو گا۔ دستور ساز اسمبلی میں مسلمان نمائندوں کی

بھرتی کوئی ایسا مشکل کام نہ تھا۔ قائداعظم کو خریدنا تو ناممکن تھا مگر دوسرے بہت سے مسلمان قیمت وصول کر کے کانگریس کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو سکتے تھے۔ یوں عبوری حکومت پر قبضے کو اولیت دی گئی اور دستور ساز اسمبلی میں شمولیت کو ثانوی حیثیت دے دی گئی۔ وائسرائے لارڈ ویول یہ ضرور چاہتے تھے کہ مسلم لیگ عبوری حکومت میں شمولیت اختیار کر لے۔ انہیں یہ اندازہ تھا کہ مسلم لیگ کو اس طریقے سے علیحدہ کر دینے سے حالات بگڑ سکتے ہیں اور برصغیر میں خانہ جنگی شروع ہو سکتی ہے۔ جھگڑا قوم پرست مسلمانوں کی نامزدگی سے متعلق تھا۔ وائسرائے کی مساعی سے معاملہ سلجھ گیا۔ فیصلہ یہ ہوا کہ عبوری حکومت کے اراکین کی تعداد چودہ ہو گی۔ ان میں سے چھ کانگریس نامزد کرے گی۔ پانچ کی نامزدگی مسلم لیگ کی ذمہ داری ہو گی۔ ایک سکھ ہو گا۔ ایک پارسی اور ایک ہندوستانی عیسائی یعنی اینگلو انڈین۔ تنازع طے ہوا تو قائداعظم نے لیاقت علی خاں۔ آئی آئی چندریگر۔ عبدالرب نشتر' راجہ غضنفر علی خاں اور جوگندر ناتھ منڈل کو کابینہ میں شمولیت کے لئے نامزد کر دیا۔ چونکہ کانگریس کابینہ میں غیر لیگی مسلمان شامل کر کے مسلم لیگ کی نمائندہ حیثیت کو چیلنج کر رہی تھی قائداعظم نے جوگندر ناتھ منڈل کا نام دے کر کانگریس دعاوی پر جوابی وار کیا جو کارگر ثابت ہوا کانگریس نے پنڈت نہرو کو عبوری کابینہ کا لیڈر بنانے کا مطالبہ کیا۔ مسلم لیگ نے یہ مطالبہ مسترد کر دیا لیاقت علی خاں نے ایک پریس کانفرنس میں یہ بات واضح کر دی کہ پنڈت نہرو صرف کابینہ کے کانگریسی حزب کے لیڈر ہیں۔

افرنگ کی سیاست

عجب آں نیست کہ اعجاز مسیحا داری
عجب ایں ہست کہ بیمار تو بیمار تر است

مسلمانوں کے متعلق عام طور پر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ حساب کتاب کے معاملے میں کسی خاص صلاحیت کے مالک نہیں۔ وزارتوں کی تقسیم کے سوال پر لارڈ ویول کی تجویز یہ تھی کہ مسلم لیگ کو ہوم ڈیپارٹمنٹ دے دیا جائے۔ مولانا آزاد کہتے ہیں کہ انہیں اس تجویز سے اتفاق تھا۔ مگر سردار پٹیل جن کے پاس یہ محکمہ تھا اسے مسلم لیگ کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ انہوں نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ اگر یہ محکمہ ان سے لے لیا گیا تو وہ حکومت سے علیحدہ ہو جائیں گے۔ رفیع احمد قدوائی نے تجویز پیش کی کہ فنانس کا محکمہ تکنیکی مضمرات کا حامل ہوتا ہے۔ لیگ کے نامزد کردہ اراکین میں سے کوئی اسے سنبھالنے کا اہل نہیں۔ انہیں یہ محکمہ پیش کر دیا جائے۔ وہ اسے قبول نہیں کریں گے۔ مولانا آزاد نے یہ نہیں بتایا کہ لیگ کے فنانس کے محکمہ کو قبول نہ کرنے کی صورت میں انہیں کون سا محکمہ دیا جائے گا کیونکہ وائسرائے کی خواہش یہ تھی کہ ایک اہم وزارت لیگ کو دے دی جائے۔ سردار پٹیل نے قدوائی کی اس تجویز سے اتفاق کیا۔

مولانا اپنی کتاب انڈیا ونز فریڈم (India Wins Freedom) میں فرماتے ہیں کہ بات وائسرائے تک پہنچا دی گئی۔ وائسرائے نے قائداعظم کو اطلاع دی۔ قائداعظم نے پیش کش فوری قبول کرنے سے گریز کرتے ہوئے وائسرائے سے دوسرے دن جواب دینے کا وعدہ کر لیا۔ انہیں معلوم تھا کہ ان کے نامزد کردہ ارکان میں سے کوئی اس محکمہ کو بحسن و خوبی سنبھالنے کی صلاحیت نہ رکھتا تھا۔ مولانا آزاد کے خیال کے مطابق وہ نوابزادہ لیاقت علی خاں کو بھی اس محکمہ کو خاطر خواہ طریق سے چلا لینے کا اہل نہ سمجھتے تھے۔ چودھری محمد علی کا تعلق اسی محکمہ سے تھا۔ انہیں جب یہ اطلاع ملی تو انہوں نے اس محکمہ کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے قائداعظم کو پیش کش قبول کر لینے کا مشورہ دیا اور کہا کہ وہ اس ضمن میں لیاقت علی خاں کی مدد کریں گے اور انہیں کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

——— فنانس کا محکمہ کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔ اور نوابزادہ لیاقت علی خاں نے اپنی کلیدی حیثیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے 28 فروری 1947ء کو ایک ایسا بجٹ پیش کیا جس نے اہل ثروت ہندوؤں کو اس قدر ہراساں کیا کہ وہ چیخ اٹھے۔ بجٹ کی تجاویز کا ہدف ہندو تاجر طبقہ تھا۔ لیاقت علی خاں کی تمام بجٹ تجاویز کانگریسی اعلانات سے ماخوذ تھیں۔ کانگریس اپنے اعلانات کو عملی صورت میں دیکھ کر ششدر رہ گئی۔ انہیں یہ اندازہ ہی نہ تھا کہ ان پالیسیوں کے اتنے دور رس نتائج ہوں گے اور زخم کھائیں گے ان کے اپنے' وہ ثروت مند ہندو جو کانگریس کی مالی اعانت کیا کرتے تھے۔ وہ بڑے بڑے سیٹھ جو کانگریس کو کروڑوں روپے چندہ دیتے ہوئے ذرا بھی تامل نہ کرتے تھے۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ یہ کروڑوں روپے وہ بغیر کسی ہچکچاہٹ کے چٹکی بجاتے میں کما لیں گے۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں نے اپنی بجٹ تقریر کے آغاز میں یہ اعلان کیا تھا کہ وہ ان تفاوتوں کو ختم کرنے کی حتی الامکان کوشش کریں گے جو رئیسوں اور غریبوں کی آمدن اور ان کے رہائش کے معیار میں موجود ہیں۔ کانگریس ایک مدت سے ان تفاوتوں کو ختم کرنے کا اعلان کر رہی تھی۔ کانگریس کا 1945ء کا منشور اسی سماجی انصاف پر مبنی تھا۔ پنڈت نہرو نے عبوری حکومت میں شمولیت کے وقت بھی اس قسم کا اعلان کیا تھا اور کہا تھا کہ کانگریس عوام کے معیار زندگی کو بہتر بنانے کے لئے کوشاں ہے۔ ہماری جدوجہد اس ناہمواری کے خلاف ہے۔ ہم ان حلقوں کی طرف خصوصی توجہ دیں گے جو اقتصادی اعتبار سے پسماندہ ہیں۔ مولانا آزاد تو کہتے ہیں کہ پنڈت نہرو نظریاتی بھول بھلیاں میں کچھ ایسے کھو جاتے تھے کہ انہیں حقائق کا خیال ہی نہ رہتا تھا۔ مگر اس اعلان کا ان کے سوشلزم سے دور کا تعلق بھی معلوم نہ ہوتا تھا۔ مولانا آزاد نے ان کی اس پریس کانفرنس کو جس میں انہوں نے کیبنٹ مشن کے پلان کی ذاتی تشریح کرتے ہوئے اسے مسلم لیگ کے لئے ناقابل قبول بنا دیا ان کی نظریاتی کشمکش کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ وہ خود اقرار کرتے ہیں کہ پنڈت نہرو کی تشریح کانگریس کی قرارداد کی مخالف تھی۔ کانگریس اس قرارداد کی رو سے کیبنٹ مشن کی تجاویز منظور کر چکی تھی۔ اور پنڈت نہرو نے اپنی پریس کانفرنس میں ایسی باتیں کر دیں کہ مسلم لیگ جو کانگریس سے پہلے ان تجاویز کو قبول کر چکی تھی اپنے فیصلے پر نظرثانی کرنے پر مجبور ہو گئی۔ کانگریس نے ان کی تشریح کو غلط قرار دینے سے احتراز کیا۔ انگریزوں نے اسے الفاظ کی

شعبدہ بازی سے چھپانے کی کوشش کی۔ کیا یہ سب کچھ جان بوجھ کر تو نہیں کیا گیا؟ کیبنٹ مشن کی تجاویز کانگریس نے اس وقت قبول کی تھیں جب مولانا آزاد کانگریس کے صدر تھے۔ وہ یہ سمجھتے تھے کہ اس سنہری موقع کو ہاتھ سے نکلنے نہیں دینا چاہیے مسلم لیگ نے یہ تجاویز قبول کر لی ہیں۔ متحدہ ہندوستان کی آزاد حکومت کے وجود میں آنے کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں۔ پنڈت نہرو کو شاید اقتدار میں مسلم لیگ کی شمولیت پسند نہیں آئی۔ یہ بھی ممکن ہے کہ انہیں صوبائی گروپوں کے مرکز سے الگ ہو جانے کا احتمال ہو اور انہوں نے ان تجاویز کو ریزہ ریزہ کر دینے کی دانستہ کوشش کی ہو؟ اگر پنڈت نہرو وہ پریس کانفرنس نہ کرتے۔ اگر وہ اس پریس کانفرنس میں کیبنٹ مشن کی تجاویز کو قبول کر لینے کی تائید کر دیتے۔ اور دستور ساز اسمبلی میں کانگریس کی مشروط شمولیت کو غیر مشروط اور آزاد قرار دے کر دنیا کے لئے ابہام پیدا کر کے ان کو مشکوک نہ بنا دیتے تو ———؟؟؟ ——— یہ تاریخ کی ایک بہت بڑی "اگر" ہے ———

مسلم لیگ کو یہ احساس پیدا ہو گیا کہ کانگریس کے ساتھ برصغیر میں باعزت طریقے سے رہنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔ کانگریس مسلمانوں کو ان کے حقوق دینے کے لئے تیار نہیں۔ کانگریس انہیں غلام بنا کے رکھنا چاہتی ہے۔ انہیں پاکستان ہر قیمت پر حاصل کرنا ہو گا۔ اس کے بغیر انہیں آزادی نصیب نہ ہو گی۔

نوابزادہ لیاقت علی خاں کے بجٹ نے بھی کانگریسی حلقوں کو یہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ مسلم لیگ کے ساتھ مفاہمت ممکن نہیں۔ لیاقت علی خاں نے نمک پر ایکسائز ڈیوٹی ختم کر دی۔ کانگریس ایک مدت سے اسے ختم کرنے کے لئے تگ و دو کر رہی تھی مگر اسے ختم کرنے کی سعادت مسلم لیگ کو حاصل ہوئی اور کانگریس کو یہ بات بالکل پسند نہ آئی۔ ٹیکس کے قابل آمدنی کی حد دو ہزار سے بڑھا کر پچیس سو کر دی گئی۔

ایک لاکھ سے زیادہ منافع کمانے والے تاجر کے منافع پر پچیس فیصد ٹیکس لگا دیا گیا۔ پانچ ہزار سے اوپر کی رقم پر کیپٹیل گینز ٹیکس عائد کر دیا گیا۔ لیاقت علی خاں کی بجٹ تقریر میں افتتاحی اور اختتامی پیراگراف میں ہندوستان کو برصغیر قرار دیا گیا۔ روزنامہ "ہندوستان ٹائمز" نے اس امر کا خصوصی نوٹس لیا۔ اخبار کا کہنا تھا کہ برصغیر کا ذکر لیاقت علی خاں نے اس لئے کیا تھا کہ وہ ہندوستان کی تقسیم کے حامی تھے۔

سردار پٹیل اور راج گوپال اچاریہ نے بجٹ تجاویز کی مخالفت کی۔ سردار پٹیل کا خیال تھا کہ یہ سب کچھ کانگریس کو ہراساں کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے۔ بجٹ کا ہدف تاجر طبقہ ہے جس میں ہندوؤں کی اکثریت ہے۔ اور یہ انہیں نقصان پہنچانے کا ایک انداز ہے۔ مولانا آزاد کہتے ہیں کہ انہوں نے اپنے رفقائے کار کو سمجھانے کی بہتیری کوشش کی۔ انہیں بتایا کہ بجٹ کانگریس کے اعلانات سے اخذ کیا گیا ہے۔ مگر ان کی ایک نہ سنی گئی ——— لوگ تو کہتے ہیں کہ لیاقت علی خاں کے بجٹ نے سردار پٹیل کو برصغیر کی تقسیم قبول کرنے پر مجبور کر دیا۔ اور اس ضمن میں مولانا آزاد کا حوالہ دیا جاتا ہے۔ مولانا آزاد نے سردار پٹیل کی مخالفت اور برہمی کا ذکر ضرور کیا ہے مگر ان حالات میں یقین دہانیوں کے بغیر (جو ماؤنٹ بیٹن کی آمد پر انہیں مل گئیں) ان کا تقسیم کے اصول کو تسلیم کر لینا کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے۔ کیا یہ یقین دہانیاں سردار پٹیل نے حاصل کی تھیں ———؟؟

مولانا آزاد کہتے ہیں کہ شملہ کانفرنس میں جب وائسرائے کی ایگزیکٹو کاؤنسل کے اراکین کی نامزدگی کا سوال پیدا ہوا تو قائداعظم نے کانگریس کے کردار پر قدغن لگانے کی کوشش کی۔ وہ یہ بھی چاہتے تھے کہ کانگریس کسی مسلمان کو کاؤنسل کی رکنیت کے لئے نامزد نہ کرے۔ حالانکہ کانگریس کے نامزد کردہ مسلمان اراکین اور لیگ کے مسلم اراکین کی تعداد مسلمانوں کو اس کاؤنسل میں اکثریت کی حیثیت دے سکتی تھی۔ اور مسلمان برصغیر کی کل آبادی کا پچیس فیصد ہوتے ہوئے بھی کاؤنسل میں نمائندگی کے اعتبار سے اس ملک کی اکثریت شمار ہو سکتے تھے۔ یوں ہندو اراکین کی تعداد بھی محدود ہو جاتی۔ یوں قائداعظم نے کانگریس کے قومی کردار کو فرقہ واریت تک محدود کرنا چاہا۔ مولانا کی دلیل بظاہر تو واقعی بہت عمدہ اور بے ضرر سی معلوم ہوتی ہے مگر اس کے مضمرات کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ کانگریسی مسلمانوں کی نامزدگی کی مخالفت جس کے لئے قائداعظم کو ہدف تنقید بنایا جاتا ہے۔ بے وجہ نہ تھی۔ وائسرائے لارڈ ویول نے تو خضر حیات خاں ٹوانہ جیسے لوگوں کو نمائندگی دینے کا ارادہ کر رکھا تھا جن کے نزدیک مسلمان قوم کے مفادات محض فرقہ واریت کے مترادف تھے۔ خضر حیات خاں نے مولانا سے ملاقات بھی کی تھی۔ اور ان سے عبوری حکومت میں وائسرائے کی طرف سے اپنی نامزدگی کی مخالفت

نہ کرنے کا وعدہ بھی لیا تھا۔ قائداعظم کی طرف سے ایسے نمائندوں کی نامزدگی کی مخالفت باعث تعجب نہیں تھی۔ مولانا آزاد کو اس بات کا کریڈٹ ضرور جاتا ہے کہ انہوں نے کانگریس کا صدر ہوتے ہوئے اسے کانگریسی ہندو فرقہ واریت کے دائرے سے نکال کر قومی جماعت بنانے کی کوشش کی۔ یہ اور بات ہے کہ ان کی مساعی کو کامیابی حاصل نہیں ہوئی۔ یہ کہہ دینا بھی غلط نہ ہو گا کہ پس پردہ ان کی کوششوں کی مخالفت انہی کے اپنے رفقائے کار نے کی۔ اور قائداعظم کا مولانا کو "نمونہ وان میں رکھا ہوا شوپیس" کہہ دینا خلاف حقیقت نہ تھا۔

عبوری حکومت میں شمولیت کے بعد پنڈت نہرو کو سرحد کا دورہ کرنے کا خیال آیا۔ مولانا آزاد کہتے ہیں کہ اس صوبے کے متعلق کانگریس کو متضاد رپورٹیں مل رہی تھیں۔ خان برادران یعنی خان عبدالغفار خاں اور ان کے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کی طرف سے یہ رپورٹ بھجوائی جا رہی تھی کہ صوبے پر ان کا مکمل کنٹرول ہے اور ان کے مخالفین کی صوبے میں کوئی حیثیت نہیں۔ انگریزوں کی اطلاع یہ تھی کہ صوبہ سرحد پر خان برادران کی گرفت ڈھیلی ہو رہی ہے۔ پنڈت نہرو انگریز کی رپورٹ کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ انہوں نے حالات کا جائزہ لینے کے لئے صوبہ سرحد کا دورہ کرنے کا پروگرام بنایا ——— مولانا آزاد نے مخالفت کی۔ اور پنڈت نہرو کو عجلت پسندی سے منع کیا۔ ان کے کہنے کے مطابق برصغیر کے ہر صوبے میں سیاسی دھڑے بندیاں تھیں اور صوبہ سرحد میں خان برادران کے مخالف موجود تھے۔ کانگریس نے مرکز میں اقتدار سنبھالا ہی تھا اور اپنی پوزیشن ابھی مستحکم نہ کر پائی تھی۔ پنڈت نہرو کے دورے سے کانگریس کے مخالف عناصر کو اپنی مقاومت کو منظم کرنے کا موقع مل سکتا تھا۔ پنڈت نہرو کے دورے کے خلاف مولانا کی یہ دلیل ناقابل فہم ہے۔ پنڈت نہرو کی طرف سے حالات کا ذاتی جائزہ لینے کی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ معلوم یوں ہوتا ہے کہ مقصد ان کا کچھ اور تھا۔ اس دورے کی کڑی بعد کو صوبہ سرحد میں ہونے والے ریفرنڈم سے ملائی جا سکتی ہے۔ اس کے متعلق شواہد تو دستیاب نہیں۔ قیاس آرائی ہی ممکن ہے۔ پنڈت نہرو صوبہ سرحد میں اپنی موجودگی سے شاید خان برادران کے موقف کی تائید حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اور سرحد کے غیور عوام کو یہ دکھانا چاہتے تھے کہ دہلی ان کے کانگریسی زعما کے ساتھ ہے۔

پنڈت نہرو کا سرحد کا دورہ ناکام رہا۔ وہ جہاں بھی گئے سیاہ جھنڈیوں سے ان کا استقبال کیا گیا۔ ان کی کار پر پتھراؤ ہوا۔ انہیں پیشانی پر ایک پتھر لگ جانے سے چوٹ بھی آئی۔ ڈاکٹر خان صاحب کو ان کی حفاظت کے لئے ایک بار اپنا پستول بھی نکالنا پڑا۔ مولانا آزاد رقم طراز ہیں کہ خان برادران اپنی مقبولیت گنوا بیٹھے تھے۔ وہ مہمان نواز نہیں تھے۔ ان کے اس رویئے نے انہیں سرحد کے عوام سے الگ کر دیا تھا۔ پنڈت نہرو کا یہ دورہ بہت بڑا ذاتی رنگ تھا۔ اس نے کانگریس سے مسلمانوں کی بیزاری کچھ اس انداز سے ظاہر کر دی کہ اس کے متعلق شک و شبہ کی گنجائش ہی نہ رہی۔

برصغیر میں ہندو اور مسلمان آپس میں الجھ رہے تھے۔ اسے خانہ جنگی تو نہیں کہا جا سکتا۔ مگر حالات اس نہج پر رواں تھے کہ خانہ جنگی کے امکانات کو یکسر مسترد نہیں کیا جا سکتا تھا۔ عبوری حکومت میں لیگ اور کانگریس کی چپقلش بھی جاری تھی۔ لیاقت علی خاں کی سربراہی میں حکومت کے محکمہ مال نے کانگریس کو برہم کر رکھا تھا۔ سردار پٹیل کو یہ شکایت تھی کہ وہ لیاقت علی خاں کی منظوری کے بغیر چپڑاسی کی تقرری بھی نہیں کر سکتے۔ دونوں طرف اعصاب میں تناؤ پیدا ہو رہا تھا۔ لیاقت علی خاں کے بجٹ نے ہندو سیٹھوں کو بھی ناراض کر دیا تھا۔ وہ سردار پٹیل سے کہہ رہے تھے کہ غریب مسلمانوں کے ہندوؤں کی دولت کی تقسیم کے لئے واضح مطالبات متحدہ ہندوستان کی ترقی کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ثابت ہوں گے ——— سماجی انصاف کے لئے دولت، دولت مند سیٹھوں سے چھین لی جائے گی۔ مسلمانوں کی علیحدگی ہی ان تمام مسائل کا حل ہے۔ ان کے ساتھ رہنا ہندوؤں کے لئے ایک بھیانک خواب ہے۔

سردار پٹیل کو یہ بھی یقین تھا کہ پاکستان وجود میں آنے کے فوراً ہی بعد شکست و ریخت کا شکار ہو جائے گا۔ یہ ریاست دیر تک زندہ رہنے کی اہل نہیں۔ بجٹ غالباً کیم مارچ 1947ء کو پیش کیا گیا۔ اس کے چند ہی دن بعد سردار پٹیل نے اپنے ایک دوست کو بمبئی خط لکھا اور کہا کہ اگر لیگ پاکستان کے مطالبے سے دستبردار نہیں ہوتی تو پنجاب اور بنگال کی تقسیم ناگزیر ہے۔ مشرقی بنگال اور پنجاب کے کچھ حصے کے بغیر باقی تمام ہندوستان اس قدر مضبوط ہو جائے گا کہ اس سے علیحدہ ہونے والے علاقے پھر اس میں شامل ہو جائیں گے۔ سردار پٹیل کا یہ بھی خیال تھا کہ اگر ملک کو تقسیم نہ کیا گیا تو افراتفری اور

انتشار پھیل جائے گا اور تباہ ہو جائے گا کیا یہ سردار پٹیل کی کہانت تھی۔ کیا انہیں غیب کا علم تھا۔ یا ان کا یہ اعلان ان پس پردہ طے پانے والے فیصلوں کی نشاندہی کرتا تھا۔ انگریس ورکنگ کمیٹی نے 8 مارچ کو پنجاب کی تقسیم کے لئے قرارداد منظور کر کے برصغیر کی تقسیم کی اصولی تسلیم کر لیا۔ اس وقت لارڈ ویول کو برطرف کرنے کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ کرشنا مینن اور سدھیر گھوش نے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی تقرری کی جنگ جیت لی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن برصغیر کے نئے وائسرائے بن چکے تھے۔ وہ پہنچے تو 22 مارچ کو مگر اس سے پہلے ان کے متعلق تمام امور طے پا چکے تھے اور حالات کا تجزیہ کرنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ برصغیر کے مستقبل کے متعلق فیصلوں سے کانگریسی زعماء خاص طور پر پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کو آگاہ کر دیا گیا تھا۔ کانگریسی موقف میں اچانک تبدیلی کے لئے لیاقت علی خاں کے پیش کردہ بجٹ کو جواز بنانا درست معلوم نہیں ہوتا۔ کانگریس کے ایلچی انگلستان میں موجود تھے۔ انہیں بدلے ہوئے حالات کا علم تھا۔ انہیں مستقبل کے متعلق بھی شناسائی تھی۔ وہ کانگریسی لیڈروں کی تمام معروضات سے آگاہ کر رہے تھے۔ اور کانگریس ان اطلاعات کے پیش نظر فیصلے کر رہی تھی۔ انگلستان کے وزیر اعظم اٹیلی نے 17 جنوری 1947ء کو لارڈ ویول کو ایک خط لکھا۔ یہ خط 4 مارچ کو لارڈ ویول کو دوپہر کے کھانے کے بعد ملا۔ اس کے ذریعہ لارڈ ویول کو برطرف کر دیا گیا تھا۔

برصغیر کی تقسیم کے متعلق ویول کے نظریات دوسروں سے مختلف نہیں تھے۔ 1946ء کے مجوزہ اعلان کے حوالے سے ویول اس نتیجے پر ضرور پہنچ گئے تھے کہ برصغیر کی تقسیم ناگزیر ہے۔ اگست 1945ء میں انہوں نے برطانوی حکومت کو "نوٹ آن پاکستان" (Note on Pakistan) کے نام سے ایک تجویز پیش کی۔ یہ تجویز 31 اگست 1945ء کو برطانوی کابینہ کی انڈیا اور برما کمیٹی کے سامنے پیش کی گئی۔ ویول کا مفروضہ یہ تھا کہ تقسیم ہی ہندو مسلم مسئلے کا حل ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ کانگریس معمولی علاقائی تبدیلیوں کے ساتھ سندھ، پنجاب، سرحد، بلوچستان اور بنگال کے صوبوں کا پاکستان میں شمولیت کا مطالبہ کریں گے۔ انہوں نے اس ضمن میں دو سوال کئے تھے۔ علاقائی تبدیلیاں کون سی ہوں گی اور ان تبدیلیوں کے تعین کے لئے کیا طریق کار اختیار کیا جائے گا۔

سٹیفورڈ کرپس نے بھی اس ضمن میں کچھ تجاویز دوسروں سے لی تھیں۔ برصغیر میں

مقیم ایک برطانوی بیوروکریٹ جناب پنڈرل مون اور محترمہ فریڈا مارٹن نے اپنی مطالعاتی رپورٹوں میں کہا تھا کہ پاکستان کے مطالبے کے متعلق برصغیر کے سارے مسلمانوں میں اتفاق ہے۔ سب کے سب وہ اکثریتی صوبوں کے ہوں یا اقلیتی صوبوں کے پاکستان کے قیام کے حق میں ہیں۔ دونوں کا خیال تھا کہ کانگریس بالآخر یہ مطالبہ تسلیم کر لے گی۔

سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا لارڈ پیتھک لارنس نے ویول کی تحریر کے حوالے سے خالص اور صحیح مسلمان علاقوں کے متعلق وضاحت طلب کی۔ ویول نے اپنے جواب میں سندھ' بلوچستان' صوبہ سرحد کے علاوہ پنجاب کے راولپنڈی' ملتان اور لاہور ڈویژنوں کا حوالہ دیا۔ لاہور ڈویژن سے امرتسر اور گورداسپور کے اضلاع کو خارج کر دیا گیا۔ ویول نے کہا کہ پنجاب کی تقسیم کی صورت میں مسلم اکثریت کا صرف ایک ضلع گورداسپور مسلم علاقوں میں شامل نہیں ہو سکے گا۔ کیونکہ ضلع امرتسر کے ساتھ اس کا الحاق جغرافیائی ضرورت ہے لارڈ ویول نے اس جغرافیائی ضرورت کی کوئی وضاحت نہیں کی۔ یہ نہیں بتایا کہ امرتسر کے ساتھ اس مسلم اکثریتی ضلع گورداسپور کا الحاق کیوں ضروری سمجھتے ہیں۔ برطانیہ میں اقتدار سے متعلق لوگ یہ جانتے تھے کہ یہ تجویز لارڈ ویول کی نہیں بلکہ وی پی مینن کی ہے۔ اور تبصرہ یہ کیا گیا کہ لارڈ ویول نے ماہرین سے مشورہ کرنے کی بجائے صرف وی پی مینن اور بینگل راؤ (Benegal Rao) کی پیش کردہ تجاویز پر عمل کیا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن اور سرل ریڈکلف نے بھی اس تجویز پر عمل کیا۔ فرق یہ تھا کہ ایک تحصیل شکر گڑھ پاکستان کے حوالے کر دی گئی۔ دوسری دو مسلم اکثریتی تحصیلیں بٹالہ اور گورداسپور ہندوستان کو دے دی گئیں۔ وی پی مینن لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے دور میں بھی اسی طرح بارسوخ تھے۔ ویول تو ان سے پس پردہ کام لیتے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کھلم کھلا ان کی حمایت بھی کرتے تھے اور ان کے مشوروں پر عمل بھی کرتے تھے۔

تقسیم اور ریشہ دوانیاں

سر سے بہتا خون چوٹ اس کی نہ ہو
سنگ یاروں نے اٹھایا تھا ضرور

مولانا آزاد کہتے ہیں کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے برصغیر کے بگڑے ہوئے حالات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے برصغیر کی تقسیم کے لئے راہ ہموار کی۔ ماؤنٹ بیٹن نے پہلے سردار پٹیل کو قائل کیا۔ سردار پٹیل وزیرداخلہ ہونے کے باوجود وہ کچھ نہ کر سکتے تھے جو ان کے جی میں آتی تھی۔ انہیں اپنے منصوبوں کے لئے مالی اعانت کی ضرورت ہوتی تھی۔ اور محکمہ مال کے سربراہ نوابزادہ لیاقت علی خاں تھے جو پٹیل کی خواہشات کے مطابق رقم فراہم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ مولانا آزاد نے اپنی تصنیف کے قارئین کو یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ سردار پٹیل جو تقسیم برصغیر کے سخت مخالف تھے مسلم لیگ کے رویے سے اس قدر برافروختہ ہوئے کہ تقسیم کو تسلیم کرنے پر مجبور ہو گئے۔ ماؤنٹ بیٹن نے ان کے جذبات سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے انہیں برصغیر کی تقسیم کو تسلیم کرنے پر راضی کر لیا ـــــ جواہر لال نہرو" مولانا کے کہنے کے مطابق بااصول شخص تھے مگر ذاتی اثر قبول کر لیتے تھے۔ سردار پٹیل کے دلائل تو پنڈت نہرو پر اثر انداز نہیں ہوتے ہوں گے۔ جواہر لال نہرو پر ماؤنٹ بیٹن۔ خاص طور پر ماؤنٹ بیٹن کی اہلیہ لیڈی ایڈونا ماؤنٹ بیٹن کا بہت اثر تھا۔ وہ بہت ذہین اور فطین خاتون تھیں اور اپنے شوہر کے نقطہ نظر اور اس کے خیالات کو آگے بڑھانے اور مخالفین کو ان سے اتفاق پر مجبور کرنے کی صلاحیت ان میں بدرجہ اتم موجود تھی۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے سردار پٹیل کو قائل کر لیا اور لیڈی ماؤنٹ بیٹن کی مساعی سے پنڈت نہرو بھی ماؤنٹ بیٹن کے ہم خیال بن گئے۔

مولانا کو یا تو پس پردہ رونما ہونے والے واقعات کا علم نہ تھا یا انہوں نے اپنی تصنیف میں ان کا تذکرہ مناسب نہیں سمجھا۔ اس حقیقت سے تو اب انکار کیا ہی نہیں جا سکتا کہ ماؤنٹ بیٹن کا نام اسٹفورڈ کرپس نے تجویز کیا تھا۔ اور کرپس کے ذہن میں یہ بات اتارنے والا کرشنا مینن تھا۔ کرشنا مینن پنڈت نہرو کا قریبی دوست تھا۔ اور اسی نے کرپس

سے یہ کہا تھا کہ برصغیر کے لئے ماؤنٹ بیٹن کا انتخاب کر لیا جائے۔ یہ بات صیغہ راز میں اس لئے رکھی گئی تھی کہ مسلمانوں کو علم ہو جانے پر ماؤنٹ بیٹن کی تقرری کی افادیت ختم ہو جائے گی۔

مولانا آزاد کانگریس کے صدر رہ چکے تھے۔ انہیں یہ تو معلوم ہونا چاہئے تھا کہ برطانوی حکومت برصغیر کی تقسیم کے خلاف ہے اور ماؤنٹ بیٹن کو یہ مینڈیٹ دیا گیا تھا کہ وہ برصغیر کی یکجہتی کے لئے بھرپور کوشش کرے (اور شاید یہ بھی کہا گیا تھا کہ اس ضمن میں اپنی مساعی کی ناکامی کی صورت میں پاکستان کی اس طرح قطع و برید کر دے کہ یہ نوزائیدہ ملک اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے کے قابل ہی نہ رہے) برطانوی وزیراعظم اٹیلی کی طرف سے ماؤنٹ بیٹن کو ایک خط میں مکمل ہدایات دی گئی تھیں۔ انہیں کہا گیا تھا کہ وہ برصغیر میں ایک متحدہ طرز حکومت کے قیام کی کوشش کریں۔ اسی حکومت کا قیام کیبنٹ مشن کے منصوبے کے مطابق ایک دستور ساز اسمبلی کے ذریعے ہونا چاہئے۔ اگر یکم اکتوبر تک تم کامیاب نہ ہو سکو تو نئی تجاویز کے ساتھ حکومت برطانیہ کی طرف رجوع کرو۔ انتقال اقتدار کے لئے یکم جون 1948ء کی تاریخ دھیان میں رہے۔ کوشش یہ کی جائے کہ ہندوستان کی فوج کسی صورت تقسیم نہ ہونے پائے اور دفاعی انتظامات پورے برصغیر پر محیط ہوں۔ ـــــ برطانوی حکومت کو معلوم تھا کہ کانگریس صوبوں کی گروپ بندی کا کیبنٹ مشن کا منصوبہ مسترد کر چکی ہے۔ اور مسلم لیگ اس گروپ بندی کے بغیر اسے قبول کرنے کے لئے تیار نہیں۔ پھر بھی اسی پلان کو ماؤنٹ بیٹن کے مشن کی بنیاد بنانا فہم سے بالاتر ہے۔ برطانوی مورخین نے لیبر پارٹی کے نظریات کا سہارا لیتے ہوئے برطانیہ کو بدنیتی سے مبرا قرار دینے کی کوشش ضرور کی ہے۔ وہ انگریز کے کانگریس کی طرف جھکاؤ کو لیبر پارٹی کا نظریاتی مفاد کہہ کے بات ٹالتے رہے ہیں۔ انہوں نے تاریخی شواہد۔ زمینی حقائق اور انسانی میلانات کو پس پشت ڈال کر برطانیہ کو بے قصور ثابت کرنے کی بھرپور کوشش کی ہے۔ مگر حقائق کو جھٹلانا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ برطانوی مورخ قائداعظم کے کردار کو کج کرنے سے گریز نہیں کرتے۔ مگر دوسری طرف وہ ایڈونا ماؤنٹ بیٹن اور پنڈت نہرو کے تعلقات پر یوں پردہ ڈال دیتے ہوں جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ جیسے ان تعلقات کے بارے میں ان کے پاس کوئی شواہد نہ ہوں۔ حالانکہ دونوں کی تصاویر اور آپس کے

خطوط جو اشاعت پذیر ہو چکے ہیں ان بہت ہی گہرے اور قابل اعتراض مراسم کی نشاندہی کرتے ہیں جو پنڈت نہرو کو ماؤنٹ بیٹن کی اہلیہ کے اس قدر قریب لے آئے تھے۔ یہاں ہمیں اس جنسی اختلاط سے غرض نہیں جو ان حالات میں قائم ہو جاتا ہے۔ ہمیں تو ان تعلقات کے ان سیاسی نتائج سے غرض ہے جو برصغیر کے مستقبل پر مرتب ہوئے۔ پنڈت نہرو کی اہلیہ کو رحلت کئے ایک مدت ہو چکی تھی۔ وہ ایک عرصے سے مجرد زندگی گزار رہے تھے۔ برہمچاری نہیں تھے۔ ان کی ایک ایسی اولاد کا ذکر ان کے متعلق لکھی جانے والی ایک کتاب میں ملتا ہے۔ اس کو اس کی ماں نے "اناتھ آشرم" میں داخل کرا دیا تھا۔ حال ہی میں امریکہ سے شائع ہونے والی ان کی سوانح عمری میں انہیں ہم جنس پرست قرار دیا گیا ہے۔ قطع نظران تمام چیزوں کے حقیقت یہ ہے کہ پنڈت نہرو نے ماؤنٹ بیٹن سے جو طلب کیا انہیں مل گیا۔ ماؤنٹ بیٹن انکار کر ہی نہیں سکتے۔ پنڈت نہرو کی بات ٹالنا ان کے بس میں نہیں تھا۔

مولانا آزاد نے اس پلان کا ذکر نہیں کیا جو ماؤنٹ بیٹن نے پنڈت نہرو کو اس وقت دکھایا تھا جب پنڈت جی شملہ میں وائسرائے کے مہمان تھے۔ ماؤنٹ بیٹن یہ پلان برطانوی حکومت کو بھجوا بھی چکے تھے یہ خفیہ پلان جب پنڈت نہرو کو دکھایا گیا تو وہ برہم ہوئے۔ انہوں نے برملا لارڈ ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ وہ برصغیر کو بلقان بنا دینا چاہتے ہیں۔ ماؤنٹ بیٹن کے سٹاف نے اسے یہ مشورہ دیا تھا کہ وہ یہ پلان نہرو کو نہ دکھائے۔ بات نکل گئی تو معاملات بگڑ جائیں گے اور اس کی غیر جانبداری متاثر ہو گی۔ مگر ماؤنٹ بیٹن نے ان کی ایک نہ سنی۔ پنڈت نہرو ناراض ہوئے تو پلان بدل دیا گیا۔ اپنے معتمد خاص وی پی مینن کو بلایا اور اسے نیا پلان تیار کرنے کی ہدایت کی۔ لوگ کہتے ہیں کہ وی پی مینن اپنی قیام گاہ پر واپس پہنچے۔ انہوں نے شراب طلب کی۔ ایک دو پیگ چڑھانے کے بعد نیا پلان بنانے کے لئے بیٹھ گئے اور چھ گھنٹوں میں نیا پلان بنا کر ماؤنٹ بیٹن کے حوالے کر دیا۔ وی پی مینن ہندو تھے۔ کانگریس کے لیڈروں سے ان کے تعلقات تھے اور وہ برصغیر کے مستقبل کے متعلق تمام خبریں کانگریسی لیڈروں تک پہنچا دیتے تھے۔

مولانا آزاد ایک سادہ لوح انسان کی طرح کانگریس کے ہاتھوں میں کھلونا بنے رہے۔ انہوں نے اپنے گردوپیش کا جائزہ نہیں لیا۔ انہیں کدورت تھی تو صرف مسلم

لیگ اور قائداعظم سے۔ کانگریسی لیڈروں کا تعصب انہیں یا تو نظر نہیں آتا تھا یا وہ اسے کج فہمی قرار دے کر فراموش کر دیتے تھے۔ انہیں ان سازشوں کے متعلق علم نہیں ہوا جو برصغیر کے ایوان اقتدار میں ہو رہی تھیں۔ اور لارڈ ماؤنٹ بیٹن جس تمثیل کے انتہائی اہم کردار تھے۔ تمثیل کی ہدایت کار تھیں ایڈونا ماؤنٹ بیٹن۔ جن کی ہدایات کے مطابق کہانی اپنے عروج کی طرف بڑھ رہی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کے سوانح نگاروں نے اس موضوع کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا۔ اسے یوں نظر انداز کر گئے جیسے اس میں تھا ہی کچھ نہیں۔ ان کا کلچر ممکن ہے۔ ایک شادی شدہ عورت کے اس قسم کے تعلقات کو قابل اعتراض نہ سمجھتا ہو۔ بی بی سی پر ایک شہزادی کے اس قسم کے انٹرویو پر کوئی تنقید نہیں ہوئی۔ اس کی مقبولیت پر کوئی اثر نہیں پڑا اسی کو مظلوم سمجھ کر اس کی حمایت کی گئی۔ مگر یہاں تو معاملہ کچھ اور تھا۔ یہاں تو ایک برصغیر کے مستقبل کا مسئلہ تھا۔ اور ان تعلقات سے پیدا ہونے والی پیچیدگیاں برصغیر کی سیاست پر اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی تھیں۔ اور کشمیر کا تنازع، پنجاب اور بنگال کی نامنصفانہ تقسیم انہی تعلقات کا شاخسانہ ہے۔ اور برصغیر کے لوگ اس ہرزگی کی سزا ابھی تک بھگت رہے ہیں —— ایڈونا کشمیر جا پہنچیں۔ لوٹیں تو پنڈت نہرو کے موقف کے حق میں بیان داغ دیا۔ اس سے پہلے کبھی بھی برصغیر کا کوئی شخص اس کا تعلق کتنے بڑے خاندان سے کیوں نہ ہو کسی خاتون کے ذریعہ سیاست میں ایسی ہلچل پیدا نہ کر سکا تھا۔

ماؤنٹ بیٹن کی غیر جانبداری ان کے اپنے کردار کی بھینٹ چڑھ گئی۔

سردار پٹیل کے بعد پنڈت نہرو نے بھی تقسیم کو تسلیم کر لیا۔ پٹیل تو اعلانیہ یہ کہنے لگے تھے کہ ہندو اور مسلمان دو الگ قومیں ہیں انہیں یقین ہو گیا تھا کہ یہ دونوں قومیں اکٹھی نہیں رہ سکتیں۔ ہندو مسلم تنازع کا حل اب ان کی نگاہ میں تقسیم برصغیر تھا۔ وہ بھی کہنے لگے تھے کہ انگریز کو چاہئے کہ وہ برصغیر کو تقسیم کر کے رخصت ہو جائے پنڈت نہرو بھی ان کے ہم خیال تھے۔ وہ بھی کہنے لگے تھے کہ ہندوستانیوں کو خوش فہمیوں میں مبتلا ہونے کی بجائے حقیقت پسندی سے کام لینا چاہئے۔ اور بدلے ہوئے حالات کے پیش نظر حقیقت پسندی کا تقاضا ہے کہ برصغیر کی تقسیم کو تسلیم کر لیا جائے۔

مولانا آزاد کا آخری سہارا مہاتما گاندھی تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انہیں یاد کیا۔

وہ ماؤنٹ بیٹن سے ملنے گئے لوٹے تو وہ بھی تقسیم کے حق میں تھے۔ یہ تمام لیڈر سردار پٹیل پنڈت نہرو۔ مہاتما گاندھی جو کیبنٹ مشن کی تجویز کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ جو اس تجویز کے مطابق صوبوں کی گروپ بندی کو مسترد کر چکے تھے دیکھتے ہی دیکھتے یکے بعد دیگرے پاکستان کا مطالبہ مان لینے پر کیونکر راضی ہو گئے۔ انہوں نے اپنے موقف پر نظرثانی کر کے کیبنٹ مشن کا پلان پھر سے کیوں نہ تسلیم کر لیا۔ قائداعظم اس تجویز کو قبول کر چکے تھے۔ انہوں نے کانگریس کے مکر جانے پر اپنا موقف تبدیل کیا تھا۔ کانگریس نے کیبنٹ مشن کا وہ منصوبہ جس میں برصغیر کے اتحاد کی ضمانت تھی مسترد کر دیا۔ اور اس کے برعکس برصغیر کی تقسیم کا مطالبہ مان لیا۔ اس کے پس پردہ یقیناً ایسی کوئی بات تھی جس کی کشش کانگریس کو کھینچ کر اس طرف لے گئی۔

پہلے سردار پٹیل —— پارٹیشن کے مخالف

پھر پنڈت نہرو —— کانگریس کے صدر اور تقسیم ہند کے دشمن

پھر مہاتما گاندھی —— جو یہ کہا کرتے تھے کہ کانگریس نے اگر یہ مطالبہ تسلیم کر لیا تو انہیں میری لاش پر سے گزر کے جانا ہو گا۔

دو گھنٹے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ساتھ رہے۔ آئے تو وہ بھی قائل ہو چکے تھے۔

ماؤنٹ بیٹن نے ان سب کو کیا سمجھایا۔ کون سا جادو ان پر کر دیا۔ کیا لالچ دے دیا۔ کیا ان سب کو اپنے ساتھ کسی راز میں شریک کر لیا۔ یہ کیا سازش تھی۔ کہ سب ہم شرط، ہم عہد ایک ساتھ مل کے ایک قسم کی باتیں کرنے لگے۔ ماؤنٹ بیٹن اپنے مینڈیٹ کو بھول گئے۔ سردار پٹیل۔ پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی عمر بھر کے موقف سے دستکش ہو گئے۔ یہ سب کچھ بے سبب تو ہو نہیں سکتا تھا۔ اس کا سبب کچھ اتنا کشش انگیز تھا کہ کانگریس کی قیادت (وہ جن کو اس سبب کا علم ہو گیا) مرعوب اور مسحور ہو کر قائداعظم کی بات مان گئی۔ ماؤنٹ بیٹن نے ان کے کان میں کیا بات کہہ دی کہ وہ سب کے سب اپنے ماضی سے کٹ کر مستقبل کا استقبال کرنے کے لئے اکٹھے ہو گئے۔ مانا کہ سردار پٹیل کو عبوری حکومت میں تلخ تجربات کا سامنا کرنا پڑا۔ مانا کہ لیاقت علی خان نے ان کے غرور نفس کو ٹھیس پہنچائی اور وہ اپنی انا کے لئے الگ دیش کا نعرہ لگانے پر مجبور ہو گئے۔ سیاست میں اس قسم کی دشواریاں تو پیش آیا ہی کرتی ہیں۔ سردار پٹیل تو منجھے ہوئے سیاست مدار

تھے۔ اس قسم کی معمولی مشکلات تو انہیں مرعوب نہیں کر سکتی تھیں۔ اور پنڈت نہرو کے لئے تو ایسی کوئی دشواری نہ آئی تھی۔ نہ مہاتما گاندھی کو ایسے حالات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ قائداعظم سے اختلافات کی داستان تو پرانی تھی۔ اگر اس چپقلش کو ختم کرنا ہی مقصود تھا تو کیبنٹ مشن کا پلان جسے مسلم لیگ تسلیم کرنے کے بعد کانگریس کے ردعمل کے بعد اسے مسترد کر چکی تھی ابھی تک موجود تھا۔ کانگریس اسے اس صورت میں منظور کر کے جس صورت میں کیبنٹ مشن نے اسے پیش کیا تھا قائد کے اسی پلان کے متعلق پھر سے سوچنے پر مجبور کر سکتی تھی۔

سیاسی قائدین جب پبلک کے سامنے بات کرتے ہیں تو احتیاط اس غرض سے استعمال کرتے ہیں کہ یہ بات اخلاف کے لئے ہوتی ہے۔ ایسی باتوں کا چونکہ ریکارڈ رکھا جاتا ہے اس لئے انداز محتاط ہوتا ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں ان کا کوئی ریکارڈ نہیں ہوتا۔ تاریخ ان باتوں کے لئے کوئی شواہد پیش نہیں کر سکتی۔ مگر حقیقت چھپتی نہیں۔ کسی نہ کسی صورت آشکار ضرور ہو جاتی ہے۔ کانگریس کے ان تینوں رہنماؤں کے موقف کی اچانک تبدیلی کے متعلق کوئی ٹھوس شہادت تو دستیاب نہیں ہو سکی مگر بعد میں اور اس سے کچھ پہلے ہونے والی باتیں بعض امور کی نشاندہی ضرور کرتی ہیں۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے انتقال اقتدار کی تاریخ یکم جون 1948ء کی بجائے 15 اگست 1947ء مقرر کر دی۔ کسی کے ذہن و گمان میں اس وقت یہ بات نہ تھی کہ اس تاریخ کا تعین کسی خاص مقصد کے تحت کیا گیا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن کے مداح اس تاریخ کو جاپان کی شکست کی تاریخ سمجھے بیٹھے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ ماؤنٹ بیٹن کا یہ اپنا فیصلہ تھا۔ اس ضمن میں کسی نے ماؤنٹ بیٹن سے کچھ نہیں کہا تھا۔ بعد کو سردار پٹیل نے اپنی ایک تقریر میں اس معمے کا حل پیش کرتے ہوئے اعلان کر دیا کہ تاریخ کا تعین ان کی فرمائش پر کیا گیا تھا۔ وہ پاکستان کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا موقع دینے کے لئے تیار نہ تھے۔

اندازہ ہے کہ کچھ اسی قسم کی صورت اس معاملے میں پیش آئی۔ اگر اسے پہلے اور بعد کو رونما ہونے والے واقعات کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ موقف کی یہ تبدیلی بھی کسی خاص مقصد کے لئے تھی۔ پٹیل نے تو چار اگست ہی کو اپنے ایک دوست کو یہ خوشخبری دے دی تھی کہ پاکستان کی علیحدگی دیرپا نہیں ہو گی۔ پنڈت نہرو اور

مہاتما گاندھی کو بھی غالباً یہی بتایا گیا۔ انہیں شاید یہ کہا گیا کہ پاکستان زندہ تو رہ نہیں سکتا۔ سے بن جانے دیجئے۔ یہ لوگ آخر کار آپ سے آملیں گے۔ اور مہاتما گاندھی کے اس علان سے کہ پاکستان پنڈت نہرو سے پھر سے بھارت میں شمولیت کی درخواست کرے گا ور پنڈت نہرو فراخدلی کا ثبوت دیتے ہوئے اسے پھر سے آغوش میں لے لیں گے۔ یہ ندازہ ہوتا ہے کہ انہیں بھی اسی قسم کے سبز باغ دکھا کے قائل کیا گیا۔ مولانا آزاد کہتے یں کہ انہوں نے کیبنٹ مشن کے پلان کو پھر سے زندہ کرنے کی بھرپور کوشش کی مگر نہیں کامیابی حاصل نہ ہوئی گاندھی۔ نہرو۔ پٹیل اور ماؤنٹ بیٹن سب کے سب برصغیر کی قسیم کے حامی تھے۔ اور مولانا کی آواز صدا بصحرا معلوم ہو رہی تھی۔

—— تقسیم کی بات طے ہو چکی تو بنگال اور پنجاب کا مسئلہ کھڑا ہو گیا۔ صوبوں ی تقسیم کا سوال کب اور کیونکر پیدا ہوا اس سلسلے میں مزید تحقیقات کی ضرورت ہے۔ کچھ صنف کہتے ہیں کہ پنجاب کی تقسیم کا معاملہ سب سے پہلے خضر حیات ٹوانہ نے چھیڑا۔ گال کی تقسیم کی بات پہلے کس نے کی۔ اس کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے ین جون کی نشری تقریر میں پنجاب اور بنگال کی تقسیم کا ذکر کیا تھا۔ اور کہا تھا کہ اس قسیم کا مطالبہ کانگریس نے کیا ہے۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ صوبوں کی تقسیم کے علق کانگریس کی دلیل ناقابل تردید ہے۔ ایک اور جگہ انہوں نے کہا تھا کہ پنجاب کی قسیم کا مطالبہ درحقیقت سکھوں کا تھا جسے سکھوں نے کانگریس کی وساطت سے پیش کیا۔

لارڈ ویول نے بھی 1945ء میں وی پی مینن کا بنایا ہوا اسی قسم کا ایک پلان برطانوی کومت کو بھجوایا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ پنجاب کی پانچ ڈویژنوں میں سے دو ایسی ہیں جن کے کسی ضلع میں مسلم اکثریت نہیں۔ پنجاب کی کل آبادی 28.4 ملین ہے۔ اس میں سے 16.2 ملین مسلمان ہیں اور 12.2 ملین غیر مسلم۔ انہوں نے یہ بھی کہا تھا کہ 16.2 ملین لوں کو 12.2 ملین آبادی کے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں دیا جا سکتا ان کا یہ یال تھا کہ پنجاب کی تقسیم کی صورت میں خط تقسیم ضلع لاہور اور ضلع امرتسر کے میان سے گزرے گا۔ اور گورداسپور کو انہوں نے جغرافیائی تقاضوں کے تحت امرتسر سے ملحق کر دیا تھا۔ یہ پلان حقیقت میں وی پی مینن کا تیار کردہ تھا اور برطانیہ کے ارباب اقتدار ویول کی صلاحیتوں سے کماحقہ آگاہ ہوتے ہوئے ان سے کسی ایسی تخلیق کی توقع

نہیں رکھتے تھے۔ انہیں بھی یہ معلوم تھا۔ کہ یہ پلان ویول کا اپنا نہیں وی پی مینن کا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تقسیم کی بات 1945ء میں چل نکلی تھی۔ اس پلان کے متعلق برصغیر کے کسی لیڈر کو کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ کانگریسی زعماء اس سے بے خبر تھے۔ وی پی مینن ان کا اپنا آدمی تھا۔ وہ ویول کے ساتھ تھا۔ ویول کے دفتر کی کوئی بات وی پی مینن کی موجودگی میں کم از کم کانگریس کی قیادت سے خفیہ نہیں رہ سکتی تھی۔ یہ اور بات ہے کہ کانگریس اور انگریز ان دنوں کھلم کھلا اس کی بات نہیں کر رہے تھے۔ دونوں اس کے مخالف تھے۔ دونوں چاہتے تھے کہ ہندوستان کی یکجہتی کسی صورت برقرار رہ جائے۔

بات تو اس وقت نکلی جب ماؤنٹ بیٹن دہلی میں وارد ہوئے۔ وہ نہرو کی ایک گارڈن پارٹی میں شرکت کے لئے نہرو کے ہاں چلے گئے۔ انہوں نے قائداعظم کے کردار کے متعلق معلومات حاصل کرنے کے لئے سوالات نہرو سے کئے اور ان کی اہلیہ نہرو کی وکیل بن کر دنیا کے سامنے آ گئیں۔ قائداعظم کے متعلق ماؤنٹ بیٹن کو نہرو نے بتایا کہ وہ اوسط درجے کے وکیل ہیں۔ انہیں سیاسی کامیابی ساٹھ سال کی عمر کے بعد ملی۔ پنڈت نہرو نے قائداعظم کی تعریف تو کی نہیں ہو گی ماؤنٹ بیٹن کو ان کے متعلق کچھ ایسی ہی کہانیاں سنائی ہوں گی۔ ماؤنٹ بیٹن نے برصغیر پہنچتے ہی پہلا قدم غلط اٹھایا۔ نہرو سے تقریب حلف برداری کے فوراً بعد ملاقات کی اور قائداعظم سے ملاقات 15 اپریل کو ہوئی۔ (حلف برداری کی تقریب 24 مارچ کو منعقد ہوئی تھی) یہ غالباً نہرو ہی کے مختصر اشارات کا اثر تھا کہ قائداعظم کی پہلی ہی ملاقات کے بعد انہیں مرد متکبر اور دانشمند قرار دے دیا گیا۔ انہیں دماغی مریض گردانا اور ان کے متعلق ایسے ناشائستہ ریمارک دیئے جو خود اس کی کم مائیگی کے مظہر تھے۔ قائداعظم کو ڈرایا گیا۔ دھمکایا گیا۔ جب سارے حربے بیکار گئے تو بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا ذکر چھیڑ دیا۔ اور انہوں نے بعد کو یہ اقرار کیا کہ قائداعظم کو مقطوع اور کرم خوردہ پاکستان کی پیش کش کر کے درحقیقت وہ اس حقیقت سے روشناس کرانا چاہتے تھے جو قائداعظم کے مطالبے کے نتیجے میں ان کے سامنے آنے والی تھی ان کا خیال تھا کہ قائداعظم یہ بھیانک حقیقت دیکھ کر خوفزدہ ہو جائیں گے اور اپنا موقف تبدیل کر لیں گے۔ سردار پٹیل نے ماؤنٹ بیٹن کو یہ مشورہ دیا تھا کہ قائداعظم کو پاکستان

کے مطالبے سے الگ کرنے کے لئے ایسے ایسے حالات پیدا کرنے ضروری ہیں جو انہیں اپنے موقف پر نظرثانی کرنے پر مجبور کر دیں۔ بنگال اور پنجاب کی تقسیم کا اعلان اس قسم کے حالات پیدا کر سکتا تھا۔ بنگالی مسلمان بھی بنگال کی تقسیم کا سن کے مسلم لیگ کے خلاف بغاوت کر دیں گے۔ وہ بھی اپنے صوبے کی تقسیم کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ مولانا آزاد نے بھی اسی دن ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات کی۔ ان کا مشورہ بھی یہی تھا۔ سردار پٹیل نے تو یہاں تک کہہ دیا تھا کہ بنگال کی تقسیم کے اعلان کی صورت میں قائداعظم کے خلاف لیگ میں بغاوت ہو جائے گی۔ یا تو انہیں کانگریس کی شرائط تسلیم کرنی پڑیں گی۔ اگر وہ نہ مانے تو لیگی انہیں بنگال کے باہر پھینک دیں گے۔ مولانا آزاد نے قائداعظم کے خلاف شدید ردعمل کی پیش گوئی کی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن عمل تو کر رہے تھے کانگریسی مشوروں پر۔ مگر کانگریسی قیادت نے ان کے اختیارات پر قدغن لگا رکھی تھی۔ ان کے پاس پاکستان کے عوض قائداعظم کو پیش کرنے کے لئے کوئی معقول نعم البدل نہ تھا۔ قائداعظم کیبنٹ مشن پلان کو اس کی اصل حالت میں تسلیم کر چکے تھے۔ کانگریس نے اس کا حلیہ بگاڑ کے اسے ناقابل قبول بنا دیا تھا اور کانگریسی قیادت کا اصرار یہ تھا کہ مسلم لیگ اسی مسخ شدہ صورت میں یہ پلان تسلیم کر لے۔

ماؤنٹ بیٹن کے دفتر سے ملنے والی دستاویزات سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کی برصغیر میں آمد سے قبل کرشنا مینن نے ماؤنٹ بیٹن کو 13 مارچ کو خط لکھا تھا اور یہ تجویز پیش کی تھی کہ مسلم لیگ کی تشفی کے لئے برصغیر کے ان علاقوں میں جہاں مسلمانوں کی غالب اکثریت ہے پاکستان کا قیام منظور کر لیا جائے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ پنجاب اور بنگال کے وہ اضلاع یا علاقے جہاں غیر مسلموں کی اکثریت تھی پاکستان میں شامل نہ کئے جائیں۔ کرشنا مینن نے دو ریاستوں کی تجویز پیش کی تھی۔ مگر انہیں مکمل خود مختاری دینے کے لئے نہیں کہا تھا۔ امور خارجہ اور دفاع کے شعبے ان ریاستوں کے حوالے کرنے کی مخالفت کی تھی۔ انگریزوں کا خیال یہ تھا کہ پاکستان اپنے دفاع کے انتظامات نہ کر سکے گا۔ اس کے پاس اپنی علیحدہ بری فوج اور فضائیہ رکھنے کی استطاعت نہ ہو گی۔ اور سوویت یلغار کا مقابلہ نہیں کر سکے گا۔ ان کا ارادہ یہ تھا کہ برطانوی ہند کی فوج کو تقسیم نہ ہونے دیا جائے اور اسے اسی صورت میں برقرار رکھا جائے۔ مگر مسلم لیگ بجا طور پر اس کے

لئے تیار نہ تھی۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں نے 3 اپریل ہی کو اس امر کی نشاندہی کر دی تھی۔

ماؤنٹ بیٹن نے کانگریسی اور لیگی قائدین سے ملاقاتوں کے بعد صوبائی گورنروں کی میٹنگ طلب کی۔ اس میں تقسیم کی مجوزہ سکیم پر تبادلہ خیال ہوا۔ بنگال کے گورنر نے کہا کہ بنگالی مسلمان بنگال کی تقسیم کو پاکستان کے خلاف سازش قرار دے رہے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ یہ پاکستان کے مطالبے کو مسترد کرنے کے لئے کیا جا رہا ہے اس نے یہ بھی کہا کہ مسلمان صرف مشرقی بنگال کو قبول کرنے کے لئے بھی تیار نہ ہوں گے۔ اور اس خیال کو انہیں "فروخت" کرنا مشکل ہو گا۔ ماؤنٹ بیٹن نے کہا کہ مسلم لیگ تو بنگال کی تقسیم منظور کر چکی ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے بنگال کے وزیر اعلیٰ شہید سہروردی کا رد عمل معلوم کیا تو انہیں بتایا گیا کہ شہید سہروردی تقسیم کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ ہوں گے۔ وہ دوسرے مسلم اکثریت کے صوبوں سے الحاق بھی نہیں چاہیں گے۔ بنگال کو مسلم اکثریت کے ساتھ خود مختاری دینے کا مطالبہ کریں گے۔ سرحد کے گورنر اولف کیرو نے صوبے میں نئے انتخابات کرانے کی تجویز پیش کی۔ کانگریسی وزیر اعلیٰ ڈاکٹر خان صاحب نئے انتخابات کے خلاف تھے۔ سندھ کے گورنر فرانسس موڈی نے بتایا کہ سندھ مسلم پنجاب سے الحاق کے بعد اقتصادی طور پر ایک مضبوط صوبے کے طور پر ابھر کر سامنے آئے گا۔ پنجاب کے گورنر نے موڈی کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ پنجابی سندھ کے ساتھ الحاق کے حق میں نہیں ——— ماؤنٹ بیٹن کا کہنا تھا۔

پاکستان کے قیام کا فوری فیصلہ اس کے قیام میں مضمر نقائص کی بنا پر اس کی شکست و ریخت کے زیادہ امکانات پیدا کر دے گا۔ سب سے اہم مسئلہ مسلم لیگ کو اس کی حدود سے آگاہ کرنا ہے تاکہ وہ اپنا موقف تبدیل کر کے متحدہ ہندوستان میں شمولیت کے لئے تیار ہو جائے۔ مزید برآں امکان یہ بھی ہے کہ بنگال کے مسلمان جناح صاحب کی قیادت کی پیروی سے گریز کریں گے۔ صوبہ سرحد میں نئے انتخابات کے نتیجے میں اگر پھر کانگریس نے فتح حاصل کر لی تو پاکستان صرف سندھ اور پنجاب کے کچھ حصے کا نام رہ جائے گا۔

پاکستان کے قیام سے قبل پاکستان کے متعلق ماؤنٹ بیٹن کے خیالات انکی پاکستان دشمنی کا بین ثبوت تھے۔ انہیں غیر جانبدار کہنا غیر جانبداری کی تضحیک ہے۔ وی پی مینن

نے جو اپنی منافقیں شخصیت کی وجہ سے ماؤنٹ بیٹن کے معتمد خاص بن گئے تھے سردار پٹیل کو اطلاع دی کہ پنڈت نہرو نے تقسیم کے اعلان کو دستور ساز اسمبلی کو اپنا کام مکمل کر لینے تک موخر کرنے کے لئے کہا تو ماؤنٹ بیٹن نے جواب دیا کہ تقسیم کو موخر کرنا مناسب نہیں۔ کیونکہ مسلم لیگ کو پیش کیا جانے والے مقطوع پاکستان کے واپسی کے امکانات بدرجہ اتم موجود ہیں۔ وی پی مینن نے مزید کہا کہ وہ خود بھی ماؤنٹ بیٹن کے اس تجزیے سے متفق ہے۔ اب ہمارا نعرہ یہ ہونا چاہئے کہ اتحاد کے لئے تقسیم کا اعلان کر دو۔

ان تاریخی حقائق سے معلوم ہوتا ہے کہ پٹیل، نہرو اور گاندھی جی کا تقسیم برصغیر کے مطالبے کو تسلیم کر لینا بے مقصد نہ تھا۔ یہ اور بات ہے کہ انہوں نے مولانا آزاد کو ہی راز میں شریک کرنے سے احتراز کیا۔ شاید اس لئے کہ مولانا مسلمان تھے۔ خیال تو یہ ہے کہ مولانا کو بھی یہ خبر سن کر اتنی ہی حیرت ہوتی جتنی سردار پٹیل کو ہوئی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کے عملے کے انگریز اراکین بھی اس سازش میں شریک تھے۔ ان کے عملے سے متعلق کسی مسلمان کا ذکر سننے میں نہیں آیا۔ ماؤنٹ بیٹن وی پی مینن کو ہمراہ لے کر اپنا پلان منظور کرانے کے لئے لندن چلے گئے۔ واپس آئے تو برصغیر کے قائدین کو منظور شدہ مسودہ دکھا دیا۔ تین جون کو اپنی نشری تقریر میں برصغیر کی آزادی کا اعلان کیا اور چار جون کو انتقال اقتدار کی تاریخ کا اعلان کر کے سب کو حیرت میں ڈال دیا۔ پاکستان کو اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے لئے صرف بہتر دن دیئے گئے جبکہ ماؤنٹ بیٹن خود اپنے چیف آف ناف لارڈ اسمے کو ایک تار میں یہ کہہ چکے تھے کہ پاکستان کو ایگزیکٹو کے قیام کے لئے چھ سے آٹھ ماہ درکار ہوں گے۔

لوگ یہ سوچتے رہے کہ یہ بھی لارڈ ماؤنٹ بیٹن کا ایک عظیم کارنامہ ہے۔ مگر سردار پٹیل نے اپنی تقریر میں آخرکار بھانڈا پھوڑ دیا۔ یہ بتا دیا کہ انتقال اقتدار کی تاریخ ان کے کہنے پر مقرر کی گئی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ پاکستان کو استحکام کے حصول کے لئے موقع ہی فراہم نہ کیا جائے۔

بنگال کے متعلق انگریز کی توقعات صحیح ثابت ہوئیں۔ حسین شہید سہروردی بنگال کی تقسیم کے حق میں تھے وہ بنگال میں کانگریس کے ساتھ مل کے مخلوط حکومت کے قیام کے حق میں نہ تھے۔ مگر کانگریس کا نیا نعرہ تقسیم برائے اتحاد ان کے راستے کی بڑی رکاوٹ

تھا۔ کانگریس نے بنگال کی تقسیم بھی تسلیم کر لی۔ قائداعظم نے ماؤنٹ بیٹن کو بتا دیا تھا کہ انہیں بنگال کی تقسیم سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اگر بنگال متحد رہ کر آزادی حاصل کرنا چاہتا ہے تو انہیں کوئی اعتراض نہ ہو گا۔ سہروردی نے بنگال کی تقسیم کو نومبر سینتالیس تک موخر کرنے کے لئے کہا ماؤنٹ بیٹن نے یہ درخواست منظور نہیں کی۔ ماؤنٹ بیٹن متحدہ بنگال کے عوض صوبہ سرحد کا سودا کرنا چاہتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ اگر مسلم لیگ صوبہ سرحد پر اپنا دعویٰ واپس لے لے تو وہ متحدہ بنگال کی آزادی تسلیم کر لیں گے۔ مسلم لیگ صوبہ سرحد سے دستبردار ہونے کے لئے تیار نہ تھی معاملہ لٹک گیا۔ سہروردی نے متحدہ بنگال کی آزادی کے لئے مر توڑ کوشش کی۔ سرت چندر بوس کرن شنکر رائے دو کانگریسی ہندو قائدین اور سہروردی کے درمیان سمجھوتہ ہو گیا۔ آزادی کے اعلان سے کوئی دس دن پہلے اس سمجھوتے کا اعلان کر دیا گیا کہا گیا کہ بنگال میں انتخابات کے لئے حلقے الگ الگ نہیں بلکہ مخلوط ہوں گے۔ آزاد بنگال برصغیر کے دوسرے ممالک سے اپنے رشتے خود استوار کرے گا۔ بنگالی وزارت میں مسلمانوں اور ہندوؤں (بشمول شیڈولڈ کاسٹس) کی نشستیں برابر ہوں گی۔ سولہ مسلمانوں اور چودہ ہندوؤں پر مشتمل دستور ساز اسمبلی بنگال کا نیا دستور تشکیل دے گی۔

بوس اور رائے کو اس سمجھوتے کے لئے کانگریس کی ہائی کمان کی تحریک حاصل نہیں تھی۔ پٹیل نے بوس کو معاہدے سے منحرف ہو جانے کی ترغیب دی۔ بوس تیار نہیں ہوئے اور انہوں نے پٹیل کی بات ماننے سے انکار کر دیا ——

27 مئی کو پنڈت نہرو نے بنگال کے اتحاد کو اس صورت میں تسلیم کرنے کا اقرار کیا اگر متحدہ بنگال ہندوستانی یونین کے ساتھ الحاق پر راضی ہو جائے۔ انہوں نے بنگالی ہندوؤں کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ سہروردی انہیں گمراہ کر رہا ہے آزاد بنگال میں مسلم لیگ کو بالادستی حاصل ہو گی۔ اور بنگال درحقیقت پاکستان کا حصہ بن کے رہ جائے گا۔ ماؤنٹ بیٹن کی سعادت مندی کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے لندن سے بنگال کی آزادی کے متعلق فیصلہ کرا لیا تھا۔ نہرو کی مخالفت پر انہوں نے منصوبہ ترک کر دیا۔ اپنی اہلیہ کی موجودگی میں نہرو کی مخالفت ماؤنٹ بیٹن کے بس کی بات نہ تھی۔ نہرو تو کیا وہ پٹیل کی بات سے انکار کرتے ہوئے ہچکچاتے تھے۔ سہروردی کا خیال تھا کہ فرقہ واریت اور اس سے پیدا

ہونے والی کشمکش کو ختم کرنے کے لئے کلکتہ کو آزاد شہر قرار دے دیا جائے۔ تقسیم ابھی ہوئی نہیں تھی کلکتہ کے متعلق فیصلہ ہونا باقی تھا۔ اس کے باوجود تجویز سردار پٹیل کو بھجوا دی گئی۔ ان سے درخواست کی گئی کہ کلکتہ کو صرف چھ مہینوں کے لئے آزاد شہر قرار دے دیا جائے۔ سردار پٹیل اس تجویز کو چھ گھنٹوں کے لئے قبول کرنے پر بھی تیار نہ ہوئے —— قائداعظم بنگال اور پنجاب کی تقسیم کے مخالف تھے۔ انہوں نے اس تجویز کو (زشت) اور قبیح قرار دیا۔ اور کہا کہ بدخواہی اور مرارت اس تجویز کے محرک ہیں۔ انہوں نے الزام تو کانگریس پر دھرا اور وائسرائے اور برطانوی حکومت سے اس دام سے بچ کر نکل جانے کے لئے کہا۔ انہیں شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ تجویز وائسرائے کو لیگ سے کدورت رکھنے والوں نے پیش کی تھی۔ اور اس کا مقصد انہیں پاکستان کے متعلق اپنا مطالبہ واپس لینے پر مجبور کرنا تھا۔ اور ان کے انکار پر پاکستان کو قطع و برید کے بعد اس قدر کمزور کر دینا تھا کہ زندہ رہنے کے قابل ہی نہ رہتا۔ قائداعظم کا کہنا تھا کہ اگر ان علاقوں کو جہاں مسلمانوں کی اکثریت نہیں پنجاب۔ اور بنگال سے اس لئے الگ کیا جا رہا ہے کہ اونچی ذات کے ہندو اور سکھ اس حکومت کے زیر سایہ رہنے کے لئے تیار نہیں جس میں مسلمانوں کی اکثریت ہے تو دوسرے صوبوں کے مسلمان بھی یہی مطالبہ کر سکتے ہیں۔ یوں پنجاب اور بنگال کے ساتھ ساتھ دوسرے صوبوں کو بھی اسی انداز سے تقسیم کیا جائے۔ قائداعظم کی تجویز معقول تھی۔ تقسیم کے لئے بنگال اور پنجاب ہی کو کیوں چنا جا رہا تھا۔ اسی اصول کا اطلاق دوسرے صوبوں پر بھی ہو سکتا تھا۔ بصورت دیگر قائداعظم نے پنجاب اور بنگال میں استصواب رائے کی تجویز پیش کی۔ ماؤنٹ بیٹن نے اسے ماننے سے بھی انکار کر دیا۔ یہ کہہ کے بات ٹال دی کہ معاملہ برطانوی حکومت کے سامنے پیش کر دیا جائے گا۔ بات برطانوی کابینہ تک پہنچی تو وائسرائے اس تجویز کے مخالف تھے کابینہ نے بھی اسے قبول نہیں کیا۔

—— قائداعظم نے اس تقسیم کی مخالفت کے عزم کا اظہار کیا تو ماؤنٹ بیٹن گھبرائے۔ ان کا خیال تھا کہ ان دنوں کے برطانیہ میں حزب مخالف کے قائد ونسٹن چرچل سے قائداعظم کے اچھے تعلقات ہیں۔ وہ چرچل کے پاس پہنچے اور ان سے قائداعظم کے نام ایک پیغام لے کر قائداعظم تک پہنچا دیا۔ چرچل نے کہا تھا —— اگر

آپ دونوں ہاتھوں سے اس پیشکش کو قبول نہیں کرتے تو پاکستان کے لئے زندگی اور موت کا مسئلہ کھڑا ہو جائے گا۔ قائداعظم اس تقسیم سے ناراض تھے اور وہ جون 1947ء کو جب ماؤنٹ بیٹن نے انہیں آزادی کا پلان دکھانے کے لئے طلب کیا تو انہوں نے کچھ لگی لپٹی رکھے بغیر اس پلان کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کر دیا۔ تعجب اس بات پر ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نہرو کے کسی اقدام کو وہ صحیح تھا یا غلط چیلنج کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ کانگریس کے احکام کی تعمیل ماؤنٹ بیٹن کا مقدر بن گئی تھی۔ انہوں نے قائداعظم کو راضی کرنے کے لئے چرچل سے سفارش کرائی۔ یہ نہیں معلوم کہ چرچل کو کیا کہانی سنائی کیونکہ ماؤنٹ بیٹن کی پیش کش کو قبول نہ کرنا پاکستان کے لئے زندگی اور موت کا سوال نہیں تھا۔ یہ سب کچھ کر لینے کے بعد ماؤنٹ بیٹن اپنی تجاویز کو واپس نہیں لے سکتے تھے۔ ایسا کرتے تو ملک میں خانہ جنگی ہو جاتی۔ مانا کہ برطانوی سپاہی کانگریس کا ساتھ دیتے مگر ہندوستان کے مسلمان سپاہیوں کو نگوں سر کر لینا اتنا آسان نہ تھا۔ اور خانہ جنگی ہو جاتی تو ملک کا کچھ باقی نہ رہتا ——

پس پردہ

آپ گردش سے ذرا دور تھا ساحل لیکن
ناخدا موج بلا خیز کا لقمہ نکلا

لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے وزیر اعظم ایٹلی سے ملاقات کے دوران ایٹلی کو یہ یقین دلایا تھا کہ وہ منصوبہ جس کی برطانوی کابینہ نے منظوری دی ہے برصغیر کے تمام لیڈروں کے لئے قابل قبول ہو گا۔ پہلے پنڈت نہرو کے برہم ہو جانے پر منصوبہ کو تبدیل کرنا پڑا تھا۔ اب اس میں کسی پیچیدگی کی گنجائش نہیں تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کو اس منصوبے کے لئے سردار پٹیل، پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی کی تحریک تو حاصل تھی۔ خدشہ تھا تو قائداعظم کی طرف سے۔ جنہیں بنگال اور پنجاب کی تقسیم پر اعتراض تھا۔ اور جن کے اعتراض کو چرچل کے سفارش نامے سے غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کی گئی تھی۔

پنڈت نہرو سے ماؤنٹ بیٹن کے تعلقات تو مثالی تھے۔ نہرو کو ہر چیز کا علم پہلے سے تھا۔ نہرو نے مارچ 1946ء میں جب وہ سنگاپور گئے تھے ماؤنٹ بیٹن سے جو ان دنوں جنوبی ایشیا کی کمانڈ کے سپریم کمانڈر تھے ماؤنٹ بیٹن ہی کے مشورے پر انڈین نیشنل آرمی کی ایک یادگار پر پھول چڑھانے سے گریز کیا تھا۔ ان کی قوم پرستی کی گہرائی کا ان کے اس اقدام سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ انڈین نیشنل آرمی سبھاش بوس نے جاپانیوں کی اعانت سے ترتیب دی تھی۔ انگریز اس فوج کے افسروں اور سپاہیوں کو غدار تصور کرتے تھے جب کہ کانگریس انہیں قومی ہیرو کا رتبہ دیئے ہوئے تھی۔ سنگاپور میں ان قومی دلدوروں کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے ایک یادگار تعمیر کی گئی تھی۔ اور پنڈت نہرو جو اس یادگار پر پھول چڑھانے کے خواہش مند تھے ماؤنٹ بیٹن کے مشورے پر پیچھے ہو رہے۔ یادگار پر پھول چڑھانا تو الگ رہا قومی دلدوروں کی اس یادگار کو یکسر فراموش کر گئے ———

1946ء میں دونوں کی ملاقات لندن میں پھر ہوئی۔ انہیں ایک دوسرے کے قریب لانے کا کردار مسٹر سٹیفورڈ کرپس نے ادا کیا۔ کرپس ان دنوں ایٹلی کی کابینہ میں چانسلر آف

ایکیمکر تھے۔ وہ محکمہ مال کے سربراہ تھے کرشنا مینن سے خفیہ گفت و شنید کے بعد اٹیلی کو ہندوستان کے وائسرائے کے لئے ماؤنٹ بیٹن کا نام تجویز کر چکے تھے کرپس نے دونوں کی ملاقات کے لئے ایک عشائیے کا اہتمام کیا اور دونوں کی گرم اختلاطی دیکھ کر محظوظ ہوئے۔ اور انہیں یہ یقین ہو گیا کہ وائسرائے کی حیثیت سے ماؤنٹ بیٹن کی نامزدگی نہرو کے لئے باعث اطمینان ہو گی۔ قائداعظم بھی ان دنوں لندن ہی میں تھے۔ مگر نہ تو انہیں اس عشائیے میں مدعو کیا گیا اور نہ ہی اس سے پیدا ہونے والے نتائج سے آگاہ کیا گیا۔

برطانیہ کی لیبر حکومت نے جو حالات پیدا کر دیئے تھے ان حالات میں اسے غیر جانبدار کہنا غیر جانبداری کی تضحیک تھی۔ اگر وائسرائے کے تقرر کے لئے انہیں پنڈت نہرو کی تحریک اور تحریک اور خوشی کی ضرورت تھی تو اس وائسرائے کے تعصب اور رغبت پر کیا اعتراض جس کی اس عہدے کے لئے نامزدگی پنڈت نہرو کی وکیل تحریک کی مرہون منت تھی۔

فریڈم ایٹ مڈ نائٹ (Freedom at Mid Night) کے مصنفین کہتے ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن نے جب منصوبہ قائداعظم کے سامنے پیش کیا تو انہوں نے اسے منظور یا مسترد کرنے کے متعلق صرف یہ کہا کہ یہ فیصلہ مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کرے گی۔ ماؤنٹ بیٹن نے اصرار کیا اور کہا کہ وہ ایک ہفتہ مزید انتظار کرنے کے لئے تیار نہیں۔ انہوں نے قائداعظم کو مخاطب کرتے ہوئے پھر کہا "آپ کو آپ کا پاکستان مل گیا ہے۔ جس کا اس سے پہلے کوئی امکان نہ تھا۔ کانگریس نے اس پلان کی منظوری کو آپ کے انکار یا اقرار سے مشروط کر دیا ہے۔ اگر انہیں یہ شبہ ہو گیا کہ آپ نے رضامندی کا اظہار نہیں کیا تو وہ بھی اپنا موقف تبدیل کر لیں گے۔ میں آپ کو آپ کے اپنے منصوبے کو تباہ کرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ کل کی میٹنگ میں یہ کہوں گا کہ جناح صاحب سے گزشتہ رات میری طویل ملاقات ہوئی۔ ہم نے پلان کی تفاصیل پر تبادلہ خیال کیا اور جناح صاحب نے مجھے یقین دلایا ہے کہ انہیں پلان سے اتفاق ہے اور جناب محترم میں اس وقت آپ کی طرف متوجہ ہوں گا۔ آپ کو زبان کھولنے کی زحمت نہیں کرنی پڑے گی۔ آپ سے صرف یہ درخواست ہے کہ آپ اپنے سر کو اس انداز سے جنبش دے دیجئے گا جس سے یہ معلوم ہو کہ آپ کو میری معروضات پر اعتراض نہیں۔ اگر آپ نے سر کو جنبش نہیں دی تو

معاملہ ختم ہو جائے گا۔ ہر چیز منہدم ہو جائے گی۔ اور میں آپ کے لئے کچھ نہ کر سکوں گا۔ اسے دھمکی نہ سمجھئے۔ یہ پیش گوئی ہے۔ اگر آپ نے سر کو جنبش نہیں دی تو میری افادیت ختم ہو جائے گی اور اس کے ساتھ ہی آپ کا پاکستان ——

قائداعظم مجبور تھے۔ قوت ان کے حریفوں کے ہاتھ میں تھی انہیں ان سازشوں کا علم تو نہ تھا جو پاکستان کے خواب کو منتشر کرنے کے لئے پس پردہ کی جا رہی تھیں۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ مقطوع اور کرم خوردہ پاکستان ان کے خوابوں کی تعبیر نہیں۔ مگر فرنگیوں اور کانگریس نے مل کر انہیں نرغے میں لے لیا تھا۔ اور اس نرغے سے نکلنا ان کے بس کی بات نہ تھی۔ وہ انکار کر سکتے تھے۔ مگر یہ انکار مسلمانوں کے مستقبل کو برباد کر سکتا تھا۔ فرنگی برصغیر سے رخصت ہو جانا چاہتے تھے قائداعظم کے انکار پر وہ اقتدار کانگریس کے حوالے کر کے چلے جاتے۔ پنجاب اور بنگال میں فسادات شروع ہو جاتے۔ سکھ اور ہندو مل کر مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے۔ سکھ اور ہندو ریاستوں کی افواج مسلمان عوام کے خلاف استعمال ہوتیں۔ یہ درست ہے کہ نقصان دوسروں کا بھی ہوتا مگر مسلمانوں کا مستقبل تاریک ہو جاتا۔ وہ انہیں۔ ڈویژن کی علیحدگی کے لئے تو تیار ہی تھے۔ انہوں نے اس تقسیم کو تسلیم کر لیا۔

دو جون کو فیصلہ ہوا۔ تین جون 1947ء کو فیصلے کا اعلان کر دیا گیا

برطانوی کابینہ نے تقسیم کے لئے کچھ اصول وضع کئے تھے۔

—— اول تو یہ کہ بنگال اور پنجاب کی قانون ساز اسمبلیوں کے مسلم اور غیر مسلم اراکین کے اجلاس الگ الگ بلائے جائیں گے۔ ان میں سے معمولی اکثریت سے صوبے کی تقسیم کے مطالبے کی منظوری کی صورت میں وائسرائے صوبوں کی تقسیم کے لئے باؤنڈری کمیشن مقرر کر دے گا۔

—— دوم یہ کہ سندھ اسمبلی کثرت رائے سے پاکستان یا ہندوستان میں شمولیت کا فیصلہ کرے گی۔

—— سوم یہ کہ سرحد کے عوام استصواب رائے کے ذریعہ پاکستان یا ہندوستان دونوں میں کسی ایک کے ساتھ الحاق کا فیصلہ کریں گے۔

—— دونوں سے کسی ایک ریاست میں شمولیت کا فیصلہ بلوچستان کا شاہی جرگہ

اور کوئٹہ میونسپلٹی کے غیر سرکاری ممبران کی اکثریت کی ذمہ داری ہو گی۔

——— اگر بنگال نے بھی تقسیم کا فیصلہ کیا تو آسام کے ضلع سلہٹ میں استصواب رائے کے ذریعہ ہندوستان یا پاکستان میں شمولیت کے لئے عوام کی رائے معلوم کی جائے گی۔

10 جون کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کی میٹنگ ہوئی۔ لیگ کی مجلس عاملہ نے اپنے جملہ اختیارات قائداعظم کو تفویض کر دیئے اور اس کے چار دن بعد کانگریس کی ورکنگ کمیٹی نے تقسیم کی تجویز منظور کر لی۔ پلان کے منظور ہونے کے فوراً ہی بعد پاکستان کے پھر سے ہندوستان میں شامل ہو جانے سے متعلق کانگریسی قائدین کے بیانات اخبارات میں شائع ہونے لگے۔ انہوں نے اس تقسیم کو عارضی قرار دیا۔ ہندو مہاسبھا نے بھی ان کا ساتھ دیا۔ کہا کہ پاکستان کے مالی وسائل بہت کم ہیں۔ وہ اقتصادی اعتبار سے زندہ رہنے کا اہل نہیں۔ اور دوبارہ ہندوستان سے الحاق کی درخواست کرے گا۔ اور یہ دونوں ممالک پھر سے ایک ہو جائیں گے۔ یہ اعلانات ہندو عوام کی تشفی کے لئے نہیں تھے۔ ان میں اعتماد کی جھلک تھی۔ یوں معلوم ہوتا تھا جیسے انہیں مستقبل میں رونما ہونے والے واقعات کا علم ہو۔ مہاتما گاندھی کا اعلان بھی اسی اعتماد کا مظہر تھا۔

چوبیس جون کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے پنڈت نہرو کو بتایا کہ قائداعظم نے ان سے پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کے پہلے اجلاس کے متعلق مشورہ طلب کیا تھا اور پوچھا تھا کہ وہ یہ اجلاس کس جگہ منعقد کریں۔ ماؤنٹ بیٹن نے نئی دہلی کا نام تجویز کیا۔ پنڈت نہرو کی خاموشی سے یہ اندازہ ہوا کہ انہیں ماؤنٹ بیٹن کی اس تجویز سے اتفاق ہے مگر بعد کو مہاتما گاندھی۔ پنڈت نہرو۔ سردار پٹیل اور راجندر پرشاد۔ کانگریس کے سارے معتبر قائدین نے اس تجویز کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور کہا کہ وہ نئی دہلی میں پاکستان کی دستور ساز اسمبلی کو اجلاس منعقد کرنے کی کبھی اجازت نہیں دے سکتے۔

اور پھر پنڈت جواہر لال نہرو نے عبوری حکومت کی تحلیل کا مسئلہ کھڑا کر دیا۔ اس کی تحلیل سے مسلم مفادات کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔ برطانوی وزیراعظم نے کانگریس کے عظیم محسن سٹیفورڈ کرپس سے بھی سفارش کرائی۔ مگر پنڈت نہرو راضی نہ ہوئے۔ برطانوی وزیراعظم اٹیلی نے عبوری حکومت کی تشکیل نو کی تجویز قبول نہ کی۔ ماؤنٹ بیٹن

نے اس فیصلے کے باوجود عبوری کابینہ کے اراکین سے استعفیٰ طلب کر لئے اور ان سے کہا کہ وہ ہندوستان کی آزادی سے متعلق قانون کی برطانوی پارلیمنٹ میں منظوری تک اپنے عہدوں پر فائز رہیں گے۔ اس کے بعد حکومت کی تشکیل نو کی جائے گی۔ لیاقت علی خاں نے نئی حکومت کی تشکیل کے متعلق تفصیل معلوم کرنے کی کوشش کی۔ مقصد یہ تھا کہ مسلم لیگ کے اراکین بدلے ہوئے حالات کا جائزہ لے کر معاملات پر غور کر سکیں۔ ماؤنٹ بیٹن نے لیاقت علی خاں کی بات پر توجہ کئے بغیر لارڈ اسے کو جو اس وقت لندن میں تھے یہ تار بھیج دیا کہ مسلم لیگ کے اراکین مستعفی ہونے سے انکاری ہیں اور ان کا مقصد یہ ہے کہ وہ مجھے ان کو برطرف کرنے پر مجبور کر رہے ہیں۔ ہندوستان کی آزادی کا قانون لندن میں منظور ہوا اور ماؤنٹ بیٹن جو اسی انتظار میں تھے قائداعظم کے احتجاج کے باوجود عبوری حکومت کی تشکیل نو کے احکام جاری کر دیئے۔ عبوری حکومت کی تشکیل نو ہوئی اور ہندوؤں کے رویئے میں انقلابی تبدیلی آ گئی۔ پاکستانی حکومت کے افسران کو ان کے دفتروں سے نکال دیا گیا اور انہیں کلرکوں کے ساتھ بیٹھ کر کام کرنے کے لئے کہا گیا۔ وہ اس قدر مجبور ہو گئے کہ اپنی کرسیاں اور میزیں دفتروں سے نکال کر باہر لے گئے اور درختوں کے نیچے بیٹھ کر کام کرنے لگے۔

قائداعظم نے دہلی سے رخصت ہوتے وقت خیر سگالی کا پیغام بھیجا۔ سردار پٹیل نے اس کے جواب میں کہا ——— ہندوستان کے جسم سے زہر نکال دیا گیا ہے۔ اور اب ہمیں تقسیم نہیں کیا جا سکتا۔ سمندر اور دریا کے پانی کی تقسیم ناممکن ہے۔ جہاں تک مسلمانوں کا تعلق ہے ان کی جڑیں اور ان کے مقدس مقامات اس سرزمین پر ہیں۔ مجھے معلوم نہیں کہ وہ پاکستان میں کیا کریں گے۔ مجھے یقین ہے کہ وہ بالآخر ہمارے پاس واپس آ جائیں گے۔

ہندوستان کی آزادی کے بعد سردار پٹیل نے امرتسر میں ایک اور اعلان کیا۔ ان کا کہنا تھا کہ مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو پاکستان میں دھکیلنا اور پاکستان کے غیر مسلموں کو سرحد پار کرا کے ہندوستان لے آنا ہندوستان کے مفاد میں ہے۔ سردار پٹیل ہی کے اس اعلان نے غیر مسلموں کو مسلمانوں پر تشدد کر کے انہیں گھروں سے نکالنے پر اکسایا۔ مشرقی پنجاب میں مسلمانوں پر تشدد ہوا۔ اس کا ردعمل مغرب میں بھی ہوا۔ ادھر ہندو اور سکھ

تشدد کا ہدف قرار پائے۔ سردار بلدیو سنگھ وزیر دفاع کی حیثیت سے فوج کو مسلمانوں کے خلاف استعمال کرنے کے حق میں تھے۔ پنجاب کے گورنر نے ان کی ریشہ دوانیوں کے متعلق جس کی تصدیق شمالی کمانڈ کے افسر کمانڈنگ جنرل مسروی نے بھی کر دی تھی ماؤنٹ بیٹن کو مطلع کیا۔ 15 جولائی کو لارڈ اسمئے نے بھی ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ بلدیو سنگھ کا رویہ ناقابل برداشت حد تک متشدد ہے اور وہ ہر طریقے سے پاکستان کو نقصان پہنچانے کے درپے ہیں —— فیلڈ مارشل آکنلک کی یہی رائے ہندوستانی کابینہ کے دوسرے اراکین کے متعلق تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ ہندوستانی کابینہ قیام پاکستان کی مخالف ہے اور یہی چاہتی ہے کہ پاکستان کسی صورت قائم نہ ہو ——

برطانوی وزراء کے بیانات جلتی پر تیل کا کام کر رہے تھے۔ پاکستان دشمنی کے لئے بے دھڑک مواد فراہم کیا جا رہا تھا۔ وزیر اعظم اٹیلی کا بیان ان کی کابینہ کے اراکین کے خیالات کا مظہر تھا۔ انہوں نے کہا تھا —— میں امید کرتا ہوں کہ یہ علیحدگی دیرپا ثابت نہیں ہو گی اور یہ دونوں ریاستیں جن کے قیام کی تجویز زیر غور ہے پھر سے متحد ہو جائیں گی۔ اور اس اعلان کے چھ دن بعد سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا نے وزیر اعظم کے بیان کی تائید کرتے ہوئے کہا تھا۔

—— یہ امید کی جا سکتی ہے کہ جب علیحدگی کے نقصانات ظہور پذیر ہوں گے تو دونوں ریاستیں ایک انڈین ڈومینین میں مدغم ہو جائیں گی۔

سکھ برصغیر کی کل آبادی کا محض 1.4 فیصد تھے۔ مگر بعض وجوہ کی بنا پر ان کی اپنی اہمیت تھی۔ دوسری جنگ عظیم میں انہوں نے انگریزوں سے بھرپور تعاون کیا تھا۔ اور 1942ء کے اعداد و شمار کے مطابق ہندوستانی فوج میں سکھ سپاہی اور جونیئر کمشنڈ افسران کی تعداد گیارہ فیصد کے قریب تھی۔ انگریزی جنگی مساعی میں ان کا حصہ ان کی اپنی آبادی کی بہ نسبت بہت زیادہ تھا۔ انہیں انگریزوں کی ہمدردیاں حاصل تھیں۔ وہ زیادہ تر پنجاب میں رہتے تھے اور پنجاب کے گورنر جینکنز ان پر خاص طور پر مہربان تھے۔ جینکنز کے ماؤنٹ بیٹن سے اچھے تعلقات تھے۔ اور ماؤنٹ بیٹن انہیں بہترین منتظم قرار دیتے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن نے مسلم لیگ کے پاکستان کے متعلق مطالبے کے تسلیم ہونے کی صورت میں سکھوں کو اپنے مستقبل کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا۔ مستقبل کے الحاق کے لئے

فیصلہ ان پر چھوڑ دیا گیا تھا اور یوں ان کی معاملہ سازی کی قوت میں بے پناہ اضافہ ہو گیا
ا۔ سکھوں کو جب یہ یقین ہو گیا کہ انگریز برصغیر سے رخصت ہو رہے ہیں تو انہوں نے
جاب میں اپنی پوزیشن کے استحکام کے لئے جدوجہد شروع کر دی۔ اس کے لئے پنجاب
ں بدامنی پھیلانے کی حکمت عملی اپنائی گئی۔ پنجاب کے ایک وزیر بھیم سین سچر اور
ھوں کے قائد ماسٹر تارا سنگھ نے ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت حالات کو خراب
رنے کے لئے ایک جلوس نکالا۔ سچر صاحب نے غیر مسلم اجتماع سے کہا کہ انہیں جلوس
النے اور اپنے خیالات کے اظہار کا مکمل اختیار ہے۔ ماسٹر تارا سنگھ نے پاکستان مردہ باد کا
رہ بلند کیا۔ اور یہ بھی کہا کہ راج کرے گا خالصہ۔ آقی رہے نہ کو —— یعنی سکھ
ومت کریں گے اور ان کی حکومت کا مخالف کوئی باقی نہ رہے گا —— جذبات پہلے ہی
شتعل تھے۔ ان نعروں نے شعلے اور بھڑکا دیئے —— لاہور میں فرقہ وارانہ فسادات
روع ہو گئے' اور اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں فسادات راولپنڈی' امرتسر اور ملتان تک جا
نچے۔ آگ بھڑکی اور بھڑک کر دوسرے شہروں میں بھی پھیل گئی۔ ماؤنٹ بیٹن نے
ھوں کے متعلق ہندوؤں کے جذبات کے بارے میں پوچھا اور یہ بھی معلوم کرنا چاہا کہ
ندوؤں کے لئے ان کی اہمیت کیا ہے۔

لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے اس استفسار کا جواب تحریر کرنے والے ان کے معتمد خاص
ی پی مینن تھے۔ انہوں نے لکھا کہ سکھوں کی حمایت کانگریس کے لئے بڑی اہمیت کی
ل ہے۔ سکھ ایک نزلت ہے۔ اور بہت سے سکھ کانگریس کے حلقہ ارادت میں شامل
یں۔ اگر کانگریس سکھوں کی حمایت سے محروم ہو جاتی ہے تو پنجاب کے ہندو مسلمانوں کا
ابلہ نہ کر سکیں گے۔ سکھ مسلم اتحاد کی صورت میں تو ہندوؤں کی پوزیشن مزید کمزور ہو
ئے گی۔ وی پی مینن کی اس تحریر پر ماؤنٹ بیٹن کے ڈپٹی پرائیویٹ سیکرٹری کا تبصرہ یہ تھا
۔ سکھ کانگریس کے لئے شمال مغربی گروپ میں داخلہ کی ضمانت ہیں۔

وی پی مینن کے نوٹ اور اس پر ماؤنٹ بیٹن کے ڈپٹی سیکرٹری کے تبصرے سے
ں معلوم ہوتا ہے جیسے تحریر ماؤنٹ بیٹن کے لئے نہیں پنڈت نہرو کے لئے تھی۔ اس
ے مسلمانوں کی مخالفت مترشح تھی اور پڑھنے والے کے لئے یہ پیغام تھا کہ اگر ان کی
امانت نہ کی گئی تو مسلمانوں کے مقابلے میں کانگریس کو نقصان پہنچے گا۔ ماؤنٹ بیٹن برصغیر

کے انگریز وائسرائے تھے۔ وہ نہ تو کانگریس کے رکن تھے نہ مسلم لیگ کے۔ غیر جانبداری ان کا اصول ہونا چاہئے تھا۔ مگر ان کے سامنے پیش کی جانے والی ایسی تحریروں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سٹاف بھی ان کے رجحانات سے واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ماؤنٹ بیٹن کی ہمدردیاں کانگریس کے ساتھ ہیں۔ وہ بھی انہیں غیر جانبدار نہیں سمجھتا تھا۔ ورنہ اس قسم کے نوٹ لکھنے کی جسارت نہ کرتا۔

گورنر پنجاب نے بھی وائسرائے کو ماسٹر تارا سنگھ اور گیانی کرتار سنگھ کے ان اعلانات سے مطلع کیا جو وہ مسلمانوں سے انتقام لینے کی غرض سے سرعام کر رہے تھے۔ وائسرائے کو یہ بھی بتایا گیا کہ سکھ قائدین پنجاب کی سکھ ریاستوں کے حکمرانوں سے رابطہ کئے ہوئے ہیں اور جنرل مسروی کی اطلاع کے مطابق راجہ فرید کوٹ سے فوجی مدد کا مطالبہ کیا گیا ہے گورنر نے مزید کہا کہ راجہ فرید کوٹ سے ان کی ملاقات ہوئی تھی۔ گو راجہ موصوف نے ان کے سوالات کا جواب دینے سے احتراز کیا مگر یہ ضرور بتایا کہ دونوں سکھ رہنما مہاراجہ پٹیالہ کے رویئے سے مایوس ہو کر ان کے پاس آئے تھے اور انہیں سیاسی قیادت سنبھالنے کے لئے کہا تھا۔ مزید برآں راجہ فرید کوٹ سے جیپ لے کر ان دونوں رہنماؤں نے ضلع فیروز پور کے بہت سے علاقوں کا دورہ کیا تھا اور سکھوں کو ہدایت کی تھی کہ وہ مسلمانوں سے نمٹنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ گورنر پنجاب نے ماؤنٹ بیٹن سے یہ درخواست بھی کی تھی کہ وہ سردار بلدیو سنگھ کو بلا کر انہیں یہ بتا دیں کہ انہیں بلدیو سنگھ کی جنگ کے لئے چندہ کی اپیل جو سترہ دوسرے سرکردہ سکھ رہنماؤں کے ساتھ مل کر انہوں نے سکھ قوم سے کی تھی کے متعلق علم ہے۔ (یہ اپیل پچاس لاکھ روپوں کی خطیر رقم کے لئے تھی اور سردار بلدیو سنگھ خزانچی نامزد کئے گئے تھے) ماؤنٹ بیٹن سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ سردار بلدیو سنگھ کو بلا کے اس ضمن میں تنبیہہ کریں کہ عبوری حکومت کے رکن کی حیثیت سے ان کی یہ انتہاپسندی مناسب نہیں۔ اس خط کے ہمراہ گورمکھی میں لکھی ہوئی اپیل اور اس کا انگریزی ترجمہ بھی ماؤنٹ بیٹن کی اطلاع کے لئے ارسال کیا گیا تھا۔ پنجاب کے گورنر جینکنز نے ماؤنٹ بیٹن کو یہ اطلاع بھی دی کہ بلدیو سنگھ فرقینہ سے پنجاب اسلحہ کی سمگلنگ کے انسداد کے لئے ہندوستانی فوج کی غیر مسلم یونٹوں کے استعمال کے متعلق سوچ رہے ہیں۔

ماؤنٹ بیٹن نے ان رپورٹوں پر توکوئی ایکشن نہیں لیا۔ انہوں نے اور لارڈ اسے (Ism: نے سکھ لیڈروں سے ملاقات کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ سکھ اپنے مفاد کے لق وثوق سے کچھ کہہ نہیں سکتے تھے۔ وہ سکھستان کے حق میں بھی تھے۔ مگر کانگریس ،ساتھ ہندوستان میں شمولیت بھی چاہتے تھے اور مسلم لیگ کے ساتھ پاکستان میں رہنے ،خواہاں بھی تھے۔

قائد اور لیاقت علی خاں کے ساتھ سکھ رہنماؤں کی ملاقات کے متعلق کوئی ریکارڈ ود نہیں۔ قائد اور لیاقت علی خاں کی زندگی میں کسی پاکستانی نے ان سے یہ نہیں پوچھا ۔ سکھوں کی علیحدگی کی وجوہ کیا تھیں۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ایک ایلچی نے نوابزادہ ت علی خاں سے ملاقات کے حوالے سے یہ انکشاف ضرور کیا ہے کہ نوابزادہ سکھوں ے معاملات طے کرنے کے متعلق پر امید تھے۔ اور انہوں نے یہ بھی بتایا تھا کہ مسلم لیگ طرف سے سکھوں کو کی جانے والی سیاسی پیش کش کانگریس کی مراعات سے بدرجہا بہتر ہے۔

مہاراجہ پٹیالہ کے ماؤنٹ بیٹن کے نام لکھے ہوئے ایک خط سے یہ معلوم ہوتا ہے ہ مہاراجہ نے قائداعظم سے ملاقات کی تھی۔ انہوں نے کہا تھا ——

—— کہ انہوں نے جناح صاحب کو پاکستان کے مطالبے سے روگردانی کے لئے ا۔ مگر ان کی بات نہیں مانی گئی۔

—— صوبہ پنجاب کی تقسیم ضروری ہے اور جب تک اس تقسیم کے لئے ھوں کے مقدس مقامات۔ ان کی جائیداد اور ان کے اثاثوں کو تحفظ نہ فراہم کیا گیا تو ہ ایسی تقسیم کی مخالفت کریں گے۔

—— صرف آبادی کی بنیاد پر پنجاب کی تقسیم ہندوؤں اور سکھوں کے لئے مناسب ہو گی۔

اور پھر ماؤنٹ بیٹن کو یہ اطلاع بھی دی گئی کہ ہندو سکھ مسلمانوں کے خلاف لعوں کی اعانت کر رہے ہیں۔ پنجاب کی ریاستوں کے تمام غیر مسلم حکمران بھی سکھوں ے ساتھ ہیں۔ مہاراجہ پٹیالہ نے اسلحہ اور گولہ بارود فراہم کرنے کا وعدہ کیا ہے اور اپنی فوج کے سپاہیوں کو وردیاں اتار کر مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لئے بھیج دیا ہے۔

فرید کوٹ کا حکمران بھی ان کی مدد کر رہا ہے۔ الور' دھولپور' بیکانیر اور بھرت پور کے راجاؤں نے سکھوں کو مسلمان کی بیخ کنی کے لئے اسلحہ فراہم کر دیا ہے ——

نجانے کیوں ماؤنٹ بیٹن ان تمام اطلاعات کے باوجود دم سادھے بیٹھے رہے۔ حالانکہ انھیں یہ علم تھا کہ برصغیر کے راجے مہاراجے انگریز کے پروردہ ہیں۔ انگریز کا احترام بھی کرتے ہیں اور اس سے خوفزدہ بھی ہیں۔ اگر وہ پنجاب کی ریاستوں اور دوسری مسلم دشمن ریاستوں کے حکمرانوں کو بلا کر ایک بار یہ بتا دیتے کہ انھیں ان کی ریشہ دوانیوں کا علم ہے تو یہ راجے اور مہاراجے سکر کر اپنے کلوں میں چلے جاتے اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کی جرات نہ کرتے۔ مہاراجہ بیکانیر سے ان کی ذاتی دوستی تھی۔ اور انہوں نے اس کے لئے سرل ریڈ کلف کا پنجاب کی تقسیم کے متعلق ایوارڈ تبدیل کرا دیا تھا۔ تو پھر مسلمانوں کے معاملے میں وہ خاموش کیوں رہے۔ کیا یہ صرف پنڈت نہرو کا احترام تھا۔ یا ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن کی ہدایت۔ یا وہ قائداعظم سے انتقام لینا چاہتے تھے۔ ان نہتے مسلمانوں کو مروا کے جن کے پاس اپنے دفاع کے لئے بندوق کے مقابلے میں محض ڈنڈے اور لاٹھیاں تھیں۔

ان ریشہ دوانیوں اور سازشوں کا نتیجہ یہ برآمد ہوا کہ پنجاب کی تقسیم کا فیصلہ کر لیا گیا۔ چار جون کی پریس کانفرنس میں انہوں نے یہ اعتراف کیا کہ انھیں ان وجوہ کا علم نہیں جن کی بنا پر پنجاب کی تقسیم کا مطالبہ کیا گیا۔ مگر جب انہوں نے پنجاب کے نقشہ کا بنظر غائر مطالعہ کیا تو دیکھا کہ ان کا اپنا تجویز کردہ منصوبہ انہی کی ملت کو تقسیم کرنے کا باعث بن گیا۔

تین جون کو تقسیم کا اعلان ہوا۔ 23 جون کو مشرقی پنجاب اور مغربی پنجاب کی اسمبلیوں کے اجلاس ہوئے (اس کے لئے پنجاب اور بنگال کی تصوراتی تقسیم پہلے سے منظور کر دی گئی تھی۔ پنجاب کے پانچ ڈویژنوں میں سے تین میں مسلمانوں کی اکثریت تسلیم کر لی گئی تھی۔ انبالہ اور جالندھر ڈویژنوں سے متعلق اراکین کو مشرقی پنجاب اسمبلی سے منسلک کر دیا گیا تھا)

مغربی پنجاب کی اسمبلی نے پنجاب کی تقسیم کے خلاف ووٹ دیا۔ تقسیم کے حق میں 27 ووٹ تھے اور اس کے خلاف 99 —— مشرقی پنجاب اسمبلی نے تقسیم کے حق

میں فیصلہ دے دیا۔ تقسیم کی حمایت میں پچاس اور اس کی مخالفت میں 22 ووٹ تھے۔

پنجاب اور بنگال کی تقسیم متوقع تھی۔ فیصلے پہلے سے ہو چکے تھے۔ قائداعظم کے احتجاج کو درخور اعتنا ہی نہیں سمجھا گیا تھا۔ انگریز قیادت اور ماؤنٹ بیٹن کو پنڈت نہرو اور ان کے رفقائے کار کی خوشنودی مقصود تھی۔ اور اس عمل کے پیچھے ایک سازش تھی۔ پاکستان کو طفلی ہی میں ختم کر دینے کی سازش۔ پلان غالباً یہ بنایا گیا تھا کہ اسے اس انداز سے تخلیق کیا جائے کہ اس میں زندگی کی رمق تک موجود نہ ہو۔ مسلمانوں کا مطالبہ بھی پورا ہو جائے اور اس کی موت کے بعد برصغیر میں مسلمانوں کی پھر سے شمولیت انھیں کانگریس کی بالادستی کے سائے میں رہنے پر مجبور کر دے گی۔

تقسیم کے عمل کی تکمیل کے لئے دونوں صوبوں کے لئے باؤنڈری کمشن کے قیام کا پلان تھا۔ باؤنڈری کمشن کی تشکیل کے لئے دو متبادل تجاویز سامنے آئیں۔

پہلے یہ کہ ہر دو کمشن کے لئے اقوام متحدہ سے تین معتبر افراد طلب کئے جائیں۔ اور ان کے ساتھ ہر صوبے کے دونوں فریقین سے تین تین ماہر مشاور اور تشخیص کنندے نامزد کر دیئے جائیں۔

دوسرے یہ کہ ہر کمشن ایک خود مختار چیئرمین اور چار دوسرے افراد پر مشتمل ہو جن میں سے دو کانگریس اور دو مسلم لیگ نامزد کرے۔

پنڈت نہرو کا کہنا تھا کہ اقوام متحدہ سے اعانت حاصل کرنے میں بہت وقت لگے گا۔ اقوام متحدہ کے ارباب اقتدار کو مختلف حکومتوں سے رابطہ قائم کرنا پڑے گا۔ اور حکومتیں جواب دینے کے لئے کافی وقت لیں گی۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ اقوام متحدہ کے بھجوائے ہوئے اشخاص اس کام کے موزوں ہی نہ ہوں۔ پنڈت نہرو کا اعتراض معقول تھا۔ قائداعظم کو پہلی تجویز کے حق میں تھے مگر انہوں نے دوسری تجویز منظور کر لی۔ وائسرائے کا خیال تھا کہ حد بندیوں کے لئے ماہر دو افراد اقوام متحدہ سے لے کر دونوں کمشنوں کے ساتھ منسلک کئے جا سکتے ہیں۔ طے یہ پایا

کہ ہر باؤنڈری کمشن کا ایک خود مختار چیئرمین ہو گا اور اس کے ساتھ دو کانگریس اور دو مسلم لیگ کے نامزد کردہ چار افراد ہوں گے۔ ان افراد کا تعلق اعلیٰ عدالتی رتبہ سے ہو گا۔ پنجاب باؤنڈری کمشن کے لئے کانگریس اپنے دو نمائندوں میں سے ایک سکھ کو

نامزد کرے گی۔ پنڈت نہرو اور قائداعظم جتنی جلدی ممکن ہو سکے اپنے نامزد کردہ افراد کے نام وائسرائے کو بھجوا دیں گے۔ باؤنڈری کمشن کے اراکین ایک میٹنگ میں چیئرمین کا انتخاب کریں گے۔ اور اس ضمن میں ان کی ناکامی کی صورت میں برصغیر کے قائدین چیئرمین نامزد کریں گے۔ نوابزادہ لیاقت علی خاں نے یہ تجویز پیش کی کہ چیئرمین کو ثالث نہ بنایا جائے بلکہ اسے محض ممبر تصور کیا جائے ان کا خیال تھا کہ باؤنڈری کمشن میں حد بندی کا فیصلہ نہ ہو سکے گا۔ دونوں فریقوں کی سفارشات آخر کار گورنر جنرل کے پاس آئیں گی جو انہیں پارٹیشن کاؤنسل میں پیش کرے گا۔ تصفیہ پارٹیشن کاؤنسل کو کرنا ہو گا۔ عدم اتفاق کی صورت میں معاملہ ثالثی عدالت کو پیش کر دیا جائے گا۔

نوابزادہ لیاقت علی خاں کی تجویز مناسب بھی تھی اور معقول بھی۔ کانگریس نے اسے تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کانگریس اس معاملے کو کسی ثالث کے سپرد کرنے کو تیار نہ تھی۔ قائداعظم نے وائسرائے کو مشورہ دیا کہ انگلستان کے وکلاء کی انجمن سے کسی ممتاز اور معروف وکیل کو بلا کر دونوں کمشنوں کا چیئرمین بنا دیا جائے۔ اور تقسیم کے متعلق اس کا فیصلہ حتمی سمجھا جائے۔ یہ شخص ایمپائر کی حیثیت سے کام کرے۔ قائداعظم کو یہ بتایا گیا کہ ثالثی عدالت کے چیئرمین کے لئے سر سرل ریڈ کلف (Sir Cyril Radcliffe) کا نام تجویز کیا گیا ہے ——

پارٹیشن کاؤنسل کی میٹنگ 27 جون کو ہوئی اور اس میٹنگ میں سرل ریڈ کلف کو دونوں کمشن کا چیئرمین نامزد کر دیا گیا اور اسے رائے فیصل کا اختیار بھی دے دیا گیا۔

پنڈت نہرو نے باؤنڈری کمشن کے شرائط کار کے متعلق وائسرائے کو ایک مراسلہ بھجوایا۔ جس میں کمشن کو یہ ہدایت کی گئی تھی کہ وہ پنجاب اور بنگال کے دونوں حصوں کی حد بندی مسلم اکثریت کے متصل علاقوں کے تعین کے بعد کرے —— اور اس عمل کے لئے باؤنڈری کمشن دیگر حقائق کو بھی پیش نظر رکھے گا۔ لیاقت علی خاں کا ڈرافٹ کانگریس کے مسودے سے کچھ مختلف تھا —— باؤنڈری کمشن کو یہ ہدایت کی جاتی ہے —— لیاقت علی خاں نے کہا تھا —— کہ وہ پنجاب کے دونوں حصوں کی حد بندی مسلمانوں اور غیر مسلموں کے متصل علاقوں کے تعین کی بنیاد پر کرے۔ اور کمشن دوسرے عناصر کو بھی ملحوظ خاطر رکھے گا لیاقت علی خاں کے مسودے پر وائسرائے کے

سٹاف کے سر جارج ایبل نے اعتراض کر دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ اس مسودے میں زور آبادی کے اعداد و شمار پر ہے۔ اور دیگر حقائق کے متعلق کمشن کو ضرورت سے زیادہ اختیارات دے دیئے گئے ہیں۔ اس کا کہنا تھا کہ کانگریس کا بھجوایا ہوا مسودہ قائداعظم منظور کر چکے ہیں مسودے میں معمولی سی ترمیم کر دی گئی۔ اور وائسرائے نے شرائط کار کا اعلان کر دیا۔ یہ اعلان 30 جون 1947ء کو کیا گیا۔

پنجاب باؤنڈری کمشن کے اراکین مندرجہ ذیل تھے۔

مسٹر جسٹس دین محمد

مسٹر جسٹس محمد منیر —— ان دونوں کو مسلم لیگ نے نامزد کیا تھا۔

مسٹر جسٹس مہرچند مہاجن

مسٹر جسٹس تیجا سنگھ —— یہ دونوں کانگریس نے نامزد کئے تھے۔

بنگال باؤنڈری کمشن کے لئے

مسلم لیگ نے جسٹس ابو صالح محمد اکرم

اور جسٹس ایس اے رحمان کو نامزد کیا

اور کانگریس نے

جسٹس سی سی بسواس اور

جسٹس بی کے مکرجی —— کے نام دیئے۔

بنگال کمشن نے 16 جولائی کو کلکتے میں کام شروع کیا۔ پھر کچھ دن کے وقفے کے بعد 4 اور 6 جولائی کو اس کی میٹنگ ہوئی پنجاب باؤنڈری کمشن نے اکیس سے اکتیس جولائی تک کام کیا۔ کمشنوں کے چیئرمین سرل ریڈ کلف مختصر سے دورے پر لاہور اور کلکتہ گئے۔ شملہ کا ان کا دورہ تو غالباً صحت افزا مقام کی سیر کے علاوہ اور کسی اہمیت کا حامل نہ تھا۔ انہوں نے اپنا صدر دفتر دہلی میں بنا لیا۔ دونوں کمشنوں کی روزانہ کی روداد ان تک پہنچتی رہی۔ چونکہ دونوں کمشنوں کے اراکین میں اتفاق رائے کے امکانات بہت کم تھے اس لئے متنازع علاقوں کے متعلق فیصلہ چیئرمین کی ذمہ داری تھی۔ سرل ریڈ کلف کو انگلستانی وکلاء کا روشن دماغ نمائندہ سمجھا جاتا تھا۔ اور اس کے متعلق کہا جاتا تھا کہ اس نے کبھی سیاست میں حصہ نہیں لیا۔ اپنے کام سے کام رکھا ہے۔ امید بھی کی جا رہی تھی کہ اس کا

فیصلہ منصفانہ اور غیر جانبدارانہ ہو گا۔ مگر سرل ریڈ کلف کے قلم سے نکلے ہوئے فیصلے تمام کے تمام پاکستان کے خلاف تھے۔

بین الاقوامی سرحدات کا تعین کرتے وقت ریڈ کلف نے نہروں' پہاڑوں' دریاؤں غرضیکہ تمام قدرتی رو بند فراموش کر دیے۔ انتظامی اکائیوں کو بھی نظرانداز کر دیا۔ ضلعے' تحصیل اور سب تحصیل کو خاطر میں لائے بغیر مسلمانوں کو ان کے اکثریتی علاقوں سے بھی محروم کر دیا۔

بنگال میں مسلم اکثریت کا ضلع مرشد آباد ہندوستان کے حوالے کر دیا گیا۔ نادیہ۔ جیسور' دینا پور اور مالدہ جو تصوراتی تقسیم میں پاکستان کے حصے میں آئے تھے۔ تقسیم کر دیئے گئے۔ کلکتہ شہر کے متعلق دونوں فریقوں کے دعاوی تھے۔ کانگریس اسے ہندو اکثریت کی بنا پر ہندوستان سے ملحق کرنے کی خواہش مند تھی۔ مسلم لیگ کا کہنا تھا کہ اس کے ورائے ساحل علاقہ میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ کلکتہ کی آبادی کا معتد بہ حصہ جدولی اقوام (اچھوتوں) پر مشتمل تھا جو صوبائی اور ملکی سیاست میں مسلم لیگ کے حلیف تھے۔

ماؤنٹ بیٹن کے عملے کے لوگوں کا کہنا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کلکتہ کے مستقبل کے متعلق بہت پریشان تھے۔ انہیں معلوم تھا کہ کلکتہ میں مسلمان جدولی اقوام کو ساتھ ملا کر اکثریت حاصل کر سکتے ہیں۔ انہیں خدشہ تھا کہ کہیں قائداعظم کلکتہ میں استصواب رائے کا مطالبہ نہ کر دیں سننے میں آیا ہے کہ قائداعظم نے مطالبہ تو کیا تھا مگر ماؤنٹ بیٹن نے اسے نامنظور کر دیا۔ کلکتہ میں پٹ سن کے سو کارخانے تھے اور شاید تمام کے تمام انگریزوں کی ملکیت تھے۔ ان کے لئے پٹ سن مشرقی بنگال سے آتی تھی۔ ایک تو انگریز اسے مشرقی بنگال کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ دوسرے ماؤنٹ بیٹن پر نہرو اور پٹیل کا دباؤ بھی تھا۔ باؤنڈری کمشن کے چیئرمین کا فیصلہ کسی اصول پر مبنی نہیں تھا۔ اب تو یہ ثابت ہو گیا ہے کہ کلکتہ کو ہندوستان کے حوالے کرنے کے لئے ریڈ کلف نے انصاف کے تمام اصول بالائے طاق رکھ دیئے تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ فیصلہ ریڈ کلف کا اپنا فیصلہ نہ تھا۔ بلکہ ماؤنٹ بیٹن اور کانگریسی قیادت کے مابین ایک خفیہ معاہدے کا شاخسانہ تھا۔ اور یہ معاہدہ بھی خفیہ نہ رہا۔ سردار پٹیل نے سرل ریڈ کلف کی دیانتداری کا بھانڈا بھی چوراہے میں پھوڑ دیا۔ 14 جنوری 1950ء کو کلکتہ میں تقریر کرتے ہوئے انہوں نے کہا

—— ہم نے برصغیر کی تقسیم اس لئے منظور کی کہ اس کا متبادل اس سے زیادہ بھیانک اور خطرناک تھا۔ مگر ہم نے اس کے لئے ایک شرط پیش کی۔ شرط یہ تھا کہ برصغیر کی تقسیم اسی صورت میں تسلیم کریں گے جب کلکتہ ہمارے حوالے کر دیا جائے۔ اگر کلکتہ چلا جاتا تو یوں سمجھئے کہ ہندوستان چلا جاتا۔ ہم نے کوئی ایسی شرط ماننے سے انکار کر دیا جس کے تحت ہم کلکتہ کو گنوا دیتے۔

سردار پٹیل کا بیان ہی صرف اس امر کی شہادت نہیں۔ کیمبل جانسن۔ جو ماؤنٹ بیٹن کے درباری مؤرخ تھے۔ نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن کی پریشانی بے وجہ نہیں تھی۔ سردار پٹیل اور ان کے ساتھی ماؤنٹ بیٹن سے یہ کمٹ منٹ لے چکے تھے کہ کلکتہ بہر صورت ہندوستان ہی کے پاس رہے گا۔ انگریزی دانشور اور مورخ لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور سرل ریڈ کلف کی حمایت میں رطب اللسان ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ دونوں دیانت دار تھے۔ اور قہر تو یہ ہے کہ کلکتہ اور کچھ دوسری مثالیں جاننے کے باوجود انہیں مطعون کرنے کے لئے تیار نہیں۔ کیا دانشورانہ ذمہ داری —— اور دانشورانہ دیانت داری اسی کا نام ہے۔

ریڈ کلف نے کلکتہ ہندوستان کے حوالے کرنے کے لئے اس کے نواح کے بہت سے علاقے جن میں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی ہندوستان کو دے دیئے معلوم یہ ہوا کہ اگر مذکورہ علاقے کلکتہ کے ساتھ ہندوستان کو نہ دیئے جاتے تو کلکتہ کی بندرگاہ کو نقصان پہنچنے کا احتمال تھا۔

صرف بنگال ہی نہیں پنجاب کے ساتھ بھی یہی سلوک کیا گیا۔۔ 1941ء کی مردم شماری کے مطابق پنجاب کے پانچ ڈویژنوں کے مختلف اضلاع کی مسلم۔ غیر مسلم اور سکھ آبادی کے تناسب کی تفصیل ذیل میں دی جاتی ہے۔

انبالہ ڈویژن:	مسلمان	غیر مسلم	سکھ
انبالہ ڈویژن	28.07 فیصد	66.81 فیصد	5.12 فیصد
ضلع حصار	28.33 فیصد	65.64 فیصد	6.03 فیصد
ضلع رہتک	17.41 فیصد	82.43 فیصد	0.15 فیصد
ضلع گڑگاؤں	33.59 فیصد	66.34 فیصد	0.07 فیصد

ضلع کرنال	30.60 فیصد	67.40 فیصد	2.00 فیصد
ضلع انبالہ	31.73 فیصد	49.30 فیصد	18.47 فیصد

جالندھر ڈویژن:

جالندھر ڈویژن	34.53 فیصد	41.16 فیصد	24.31 فیصد
ضلع کانگڑہ	4.81 فیصد	94.66 فیصد	0.53 فیصد
ضلع ہوشیار پور	32.53 فیصد	50.53 فیصد	16.93 فیصد
ضلع جالندھر	45.23 فیصد	28.27 فیصد	26.50 فیصد
ضلع لدھیانہ	36.95 فیصد	21.38 فیصد	41.67 فیصد
ضلع فیروزپور	45.07 فیصد	21.24 فیصد	33.69 فیصد

لاہور ڈویژن:

لاہور ڈویژن	58.18 فیصد	21.84 فیصد	19.98 فیصد
ضلع لاہور	60.12 فیصد	21.05 فیصد	18.32 فیصد
ضلع امرتسر	46.52 فیصد	17.35 فیصد	36.13 فیصد
ضلع گورداسپور	51.14 فیصد	29.68 فیصد	19.18 فیصد
ضلع سیالکوٹ	62.09 فیصد	26.20 فیصد	11.71 فیصد
ضلع گوجرانوالہ	70.45 فیصد	18.68 فیصد	10.87 فیصد
ضلع شیخوپورہ	63.62 فیصد	17.53 فیصد	18.85 فیصد

راولپنڈی ڈویژن:

راولپنڈی ڈویژن	85.22 فیصد	9.50 فیصد	4.98 فیصد
ضلع گجرات	85.58 فیصد	8.06 فیصد	6.36 فیصد
ضلع شاہ پور	83.58 فیصد	11.51 فیصد	4.81 فیصد
ضلع جہلم	89.42 فیصد	6.66 فیصد	3.92 فیصد
ضلع راولپنڈی	80.00 فیصد	11.83 فیصد	8.17 فیصد

ضلع میانوالی	86.16 فیصد	12.48 فیصد	1.36 فیصد
ضلع اٹک	90.42 فیصد	6.60 فیصد	2.98 فیصد

ملتان ڈویژن:

ملتان ڈویژن	75.43 فیصد	16.43 فیصد	8.4 فیصد
ضلع منٹگمری	69.11 فیصد	17.72 فیصد	13.7 فیصد
ضلع لائلپور	62.84 فیصد	18.34 فیصد	18.32 فیصد
ضلع جھنگ	82.61 فیصد	15.90 فیصد	1.49 فیصد
ضلع مظفر گڑھ	86.42 فیصد	12.75 فیصد	0.83 فیصد
ضلع ڈیرہ غازی خان	88.93 فیصد	10.90 فیصد	0.17 فیصد

یوں تو کانگریس اور سکھ دوسرے حقائق کا سہارا لے کر چناب کے مشرق کے تمام اضلاع کو ہندوستان میں شامل کرنے کے لئے دلائل دے رہے تھے۔ لاہور پر خاص طور پر توجہ دی جا رہی تھی۔ لاہور کے لئے دلیل یہ دی جا رہی تھی کہ غیر مسلم مسلمانوں سے زیادہ مالیہ ادا کرتے ہیں۔ مسلمان مالکوں کی تعداد غیر مسلموں کی بہ نسبت کم ہے۔ اپنی اس دلیل کی حمایت میں ذیل کے اعداد و شمار پیش کئے گئے تھے۔

ادا شدہ مالیہ	رقبہ کی ملکیت (ایکڑوں میں)
ضلع لاہور کی طرف سے ادا کیا جانے والا کل مالیہ	
1845065 روپے	1662456 ایکڑ
غیر مسلموں کی طرف سے ادا کیا جانے والا مالیہ	
12263837 روپے	1150659 ایکڑ غیر مسلموں کی ملکیت
مسلمانوں کی طرف سے ادا شدہ مالیہ	
581235 روپے	511797 ایکڑ مسلمانوں کی ملکیت

	زمین کے مالکان	موروثی مزارعے
غیر مسلم	104129	12529
مسلمان	93660	16101

سکھ 79477	8777

مسلم لیگ کا مطالبہ تھا کہ قانون کے مطابق متصل مسلم اکثریت کے علاقے پاکستان کے حوالے کئے جائیں۔ مسلم لیگ جالندھر کپور تھلہ' فیروزپور' فاضلکا۔ زیرہ کے علاوہ کچھ دوسرے علاقوں کا مطالبہ بھی کر رہی تھی۔ گورداسپور کے متعلق تو ایسا کوئی خطرہ محسوس نہیں کیا جا رہا تھا۔ ضلع گورداسپور میں تحصیل پٹھان کوٹ کے علاوہ باقی تین تحصیلوں میں مسلمانوں کی غالب اکثریت تھی۔ چار جون کی پریس کانفرنس میں ماؤنٹ بیٹن نے گورداسپور کا ذکر ضرور کیا تھا۔ اس کا اشارہ پر فکون نہیں تھا۔ پھر بھی لوگ یہی سوچ رہے تھے۔ کہ کھلم کھلا ناانصافی ممکن نہیں ہو گی۔ ماؤنٹ بیٹن کے اشارے کے باوجود ریڈ کلف اس قسم کی حرکت کر کے دنیا کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہیں گے۔ لوگوں کو یہ معلوم نہیں تھا کہ ایڈوینا ماؤنٹ بیٹن کی پنڈت نہرو سے رفاقت کیا گل کھلا سکتی ہے۔ ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے گورداسپور کا اس انداز سے تذکرہ باؤنڈری کمشن کے چیئرمین کو ہدایت جاری کرنے کے مترادف تھا۔

یوں تو کہا جاتا ہے کہ وائسرائے نے سرل ریڈ کلف کو رہنے کے لئے الگ جگہ دے رکھی تھی۔ سرل ریڈ کلف الگ رہتے تھے۔ مگر ایک دوسرے کے پاس آنے جانے پر کوئی پابندی نہ تھی۔ ریڈ کلف اور ماؤنٹ بیٹن دونوں دنیا والوں کی آنکھوں سے اوجھل تھے۔ اور دونوں کو آپس میں ملنے کی ایسی کوئی ضرورت بھی نہ تھی۔ پیغام بآسانی پہنچائے جا سکتے تھے۔ چودھری محمد علی لکھتے ہیں کہ قائداعظم کو جب گورداسپور کے متعلق اڑتی اڑتی خبر پہنچی تو انہوں نے مجھے ماؤنٹ بیٹن کے چیف آف سٹاف لارڈ اسمے سے بات کرنے کے لئے دہلی بھجوایا۔ وہ لارڈ اسمے کے دفتر پہنچے تو معلوم ہوا کہ اسمے صاحب سرل ریڈ کلف کی ملاقات کے لئے ریڈ کلف کے ہاں براجمان ہیں —— چودھری محمد علی نے دیوار پر لٹکتے ہوئے نقشے پر ایک ایسی لکیر دیکھی جس کے متعلق افواہ پھیل چکی تھی۔ اسمے صاحب واپس آئے تو ان سے پوچھا گیا۔ انہوں نے لاعلمی کا اظہار کیا۔ ان کے اپنے دفتر میں لٹکتے ہوئے نقشے کی طرف ان کی توجہ دلائی گئی تو پریشان سے ہو گئے۔ اور تو کچھ کہہ نہ سکتے تھے۔ یہ کہہ کے چودھری محمد علی کو ٹال دیا کہ کوئی اس سے کھیلتا رہا ہے۔ وہ بات کو ٹال کے سارا راز اگل گئے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے ماتحت تھے یہ تو کہہ نہ سکتے تھے کہ سب

کچھ کیا دھرا اسی کا ہے۔ یہ کہہ دیتے تو ملازمت سے ہاتھ دھونا پڑتے نکالے بھی جاتے اور ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف کی بدنامی ہوتی۔ انہوں نے بات کو بڑی نفاست سے ٹالنے کی کوشش کی مگر چودھری محمد علی بھی کچی گولیاں نہیں کھیلے تھے۔ وہ بات کو سمجھ گئے اور انہوں نے لارڈ اسمے کو مزید خفیف کرنا مناسب نہ سمجھا۔

ہندوؤں' سکھوں اور مسلمانوں کے علاوہ جدولی قوموں اور عیسائیوں نے بھی باؤنڈری کمشن کے سامنے دلائل پیش کئے۔ جدولی قوموں اور عیسائیوں کے بھی دو گروہ تھے۔ ایک پاکستان کے حق میں تھا دوسرا پاکستان کے مخالف پاکستان کے وکلاء کو تو لاہور کے متعلق بھی تشویش تھی۔ انہیں یہ معلوم ہو رہا تھا کہ سرل ریڈ کلف لاہور کے مستقبل کا فیصلہ کانگریس کے حق میں کرنے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ پنجاب کے گورنر جینکنز کی یہ سفارش تھی کہ لائلپور (فیصل آباد) مشرقی پنجاب کے حوالے کر دیا جائے۔ اس علاقے کی تمام مسلمان آبادی کو منٹگمری (ساہی وال) منتقل کر دیا جائے۔

ریاست بہاولپور اور ریاست بیکانیر کی طرف سے بھی کمشن کے سامنے اپنے اپنے مفاد کے متعلق دلیلیں دی گئیں ریاست بیکانیر کو یہ خطرہ تھا کہ فیروزپور ہیڈورکس مغربی پنجاب کے حوالے کر دیئے جائیں گے۔ بہاولپور کو بھی ان کے مستقبل سے دلچسپی تھی۔ بہاولپور مسلمانوں کی ریاست تھی۔ بیکانیر میں غالب اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ بیکانیر کے وکیل نے بہاولپور کے دلائل کو غلط ثابت کرنے کی کوشش کی۔ بیکانیر کے وکیل نے کہا کہ فیروزپور سے تین نہریں نکلتی ہیں۔ ہیڈورکس ستلج اور بیاس کے سنگم سے کوئی تین میل دور ہیں اور انہیں فیروزپور ہیڈورکس کہا جاتا ہے۔ ایک تو دیپالپور کینال کہلاتی ہے۔ دوسری کا نام مشرقی نہر ہے اور تیسری بیکانیر نہر کے نام سے مشہور ہے۔ یہ نہر ضلع فیروزپور سے ہوتی ہوئی فرید کوٹ ریاست میں داخل ہوتی ہے۔ اور اس ریاست میں اس کی گزرگاہ ایک دو میل سے زیادہ طویل نہیں۔ اس کے بعد یہ ریاست بیکانیر میں داخل ہو جاتی ہے۔ اور بیکانیر میں اس کے چوالیس میل بیکانیر کی ملکیت ہیں۔ اس نہر پر ایک سو اکھاون لاکھ سے زائد لاگت آئی تھی اور فیروزپور ہیڈورکس کی تعمیر کی کل لاگت دو سو گیارہ لاکھ میں سے بیکانیر نے اپنا حصہ باون لاکھ ادا کر رکھا ہے۔ بہاولپور نے اس پر کوئی رقم صرف نہیں کی۔ لہٰذا بہاولپور پر اس کا کوئی حق نہیں۔ بہاولپور کی طرف سے ان دلائل کا جواب

دے دیا گیا۔

جب زیرہ، فاضلکا اور فیروزپور کے الحاق کا مسئلہ کھڑا ہوا تو ریڈکلف نے پاکستان کے نمائندے جسٹس منیر سے کہا کہ ان علاقوں پر کسی بحث کی ضرورت نہیں۔ یہ علاقے پاکستان کے حوالے کئے جا رہے ہیں جسٹس دین محمد نے بھی لاہور ہائی کورٹ میں گورمانی کے ازالہ حیثیت عرفی کے مقدمے میں یہی بیان دیا تھا۔ انہوں نے کہا تھا کہ ریڈکلف نے انہیں یقین دلایا تھا کہ فیروزپور ہیڈورکس اور کچھ دوسرے علاقے پاکستان کو دیئے جا رہے ہیں۔

تقسیم کے اعلان پر چونکہ فسادات کا خدشہ تھا پنجاب کے گورنر نے وائسرائے سے ریڈکلف کے ممکنہ فیصلے کے متعلق رائے طلب کی۔ ان کا ارادہ پیشگی انتظامات کرنے کا تھا۔ وائسرائے کے پرائیویٹ سیکرٹری جارج ایبل (George Abel) نے گورنر پنجاب کے پرائیویٹ سیکرٹری ایبٹ (Abbiot) کو خط لکھا (خط آٹھ اگست کو لکھا گیا) اور اسے بتایا کہ تقسیم کے فیصلے کا اعلان اگلے اڑتالیس گھنٹوں میں متوقع ہے۔ اس نے یہ بھی کہا ——— میں ایک نقشہ بھیج رہا ہوں۔ جس میں سرل ریڈکلف کی طرف سے کی جانے والی حد بندیوں کی تفصیل ہے اور ان کے سیکرٹری کرسٹوفر بیومنٹ کا ایک نوٹ بھی ان حد بندیوں کے متعلق شامل ہے۔ ان سرحدات میں کسی اہم تبدیلی کا امکان نہیں۔ البتہ لاہور ضلع کے ضمن میں دیہات اور ذیل کی حد بندیوں کی تفصیل شامل کرنا ہوگی۔

گورنر پنجاب اپنے تبادلہ کے وقت یہ نقشہ ساتھ لے کر نہیں گئے۔ یہ نقشہ ان کی میز کی دراز سے ان کے جانشین کو دستیاب ہوا۔ حالانکہ بعد کو ایک تار کے ذریعہ انہیں بعض اہم تبدیلیوں کی اطلاع دے دی گئی تھی۔ مگر اندازہ یہ ہے کہ اس نقشے کو تلف کرنے کی بات ان کے ذہن سے نکل گئی۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے اس کی اطلاع ڈپٹی کمشنر فیروزپور کو بھی دے دی تھی۔ اس نقشے میں زیرہ، فیروزپور اور فاضلکا کی تحصیلیں پاکستانی علاقے میں دکھائی گئی تھیں اسی شام یعنی آٹھ اگست ہی کو ڈپٹی کمشنر فیروزپور نے اری گیشن کے چیف انجینئر سروپ سنگھ کو یہ کہلوایا تھا کہ اسے گورنر پنجاب سے حکم ملا ہے کہ چیف انجینئر اری گیشن کا دفتر ان تین تحصیلوں کے علاوہ کسی اور جگہ منتقل کر دیا جائے۔

سروپ سنگھ نے ایک خط ایک خاص ہرکارے کے ذریعہ بیکانیر ریاست کے چیف انجینئر کنور سین کو بھیجا۔ مہاراجہ بیکانیر نے ماؤنٹ بیٹن کو ایک تار ارسال کرکے ریاست کے وزیراعظم اور چیف انجینئر کو ماؤنٹ بیٹن سے ملنے کے لئے روانہ کر دیا۔ 9 اگست کو پنڈت نہرو نے بھی اس مسئلے پر اپنی تشویش ایک مراسلے کے ذریعہ ماؤنٹ بیٹن تک پہنچائی۔ پنڈت نہرو کے خط سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہیں تقسیم کی تفصیل معلوم تھی۔ انہوں نے گورداسپور اور لاہور کے کچھ علاقے کے مشرقی پنجاب کے حوالے کئے جانے کا ذکر کیا تھا۔ اور یہ کہا تھا کہ ریڈکلف غالباً گورداسپور کے عوض پاکستان کو یہ تین تحصیلیں تفویض کرنے کا ارادہ کر رہا ہے۔ پاکستان کو ان کی سپردگی مشرقی پنجاب اور بیکانیر ریاست کے لئے مضرت رساں ثابت ہوگی۔ اور یوں ہندوستان کے مفاد میں بھی نہیں ہوگی۔ یوں ہندوستان کی دفاعی لائن فیروزپور کے پل کے ذریعہ کاٹ دی جائے گی۔ اور پھر دہلی تک کوئی قدرتی رکاوٹ نہیں ہوگی۔ کوئی رو بند نہیں رہے گا۔

ریڈکلف کا ایوارڈ 9 اگست کو وائسرائے کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اور اس وقت تک پنجاب کے گورنر وائسرائے اور دونوں کے پرائیویٹ سیکرٹریوں کو اس کے مندرجات کا علم تھا۔ وائسرائے کے عملے کی میٹنگ کے ریکارڈ سے بھی یہ بات بالکل واضح ہے کہ ریڈکلف کا پنجاب سے متعلق ایوارڈ 9 اگست کو وائسرائے کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ اور ریڈکلف اسی شام اس کا اعلان کرنے والے تھے 11 اگست کو بیکانیر کے وزیراعظم سردار پنیکر اور بیکانیر ریاست کے چیف انجینئر ڈاکٹر سین کی ماؤنٹ بیٹن سے ملاقات ہوئی۔ اس ملاقات کے ناقابل تردید شواہد موجود ہیں جنہوں نے ماؤنٹ بیٹن سے فیروزپور ہیڈورکس اور گنگا نہر کے سلسلے میں مداخلت کی درخواست کی۔ اس ضمن میں ماؤنٹ بیٹن کو ایک یادداشت بھی پیش کی گئی کہ ڈاکٹر کنور سین نے اپنی تصنیف ایک انجینئر کی یادداشتیں (Reninisences ofan Engineer) میں ماؤنٹ بیٹن سے اپنی ملاقات کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ ڈاکٹر سین کہتے ہیں کہ انہوں نے جسارت سے کام لیتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن سے کہا کہ بیکانیر کے مہاراجہ کا کہنا ہے کہ اگر یہ فیصلہ تبدیل نہیں کیا جا سکا تو وہ بیکانیر کے عوام کی خوشحالی کو مدنظر رکھتے ہوئے ہندوستان کی بجائے پاکستان سے الحاق کو ترجیح دیں گے۔ ڈاکٹر سین کہتے ہیں کہ یہ بات سن کر ماؤنٹ بیٹن کے چہرے کا رنگ تبدیل ہو گیا۔

اس کے چہرے پر سائے لہرانے لگے۔ اس نے اس بات کا کوئی جواب تو نہیں دیا۔ البتہ شام کو ریڈیو پر یہ اعلان سنا گیا کہ ریڈ کلف ایوارڈ کے اعلان میں تاخیر ہو گئی ہے۔ سترہ اگست کو جب یہ اعلان ہوا تو فیروز پور ہیڈ ورکس پاکستان سے چھین کر بلاوجہ ہندوستان کے حوالے کر دیئے گئے۔

ماؤنٹ بیٹن اور ریڈ کلف کی اس "غیر جانبداری" اور "دیانت داری" کی شہادت ریڈ کلف کے سیکرٹری کرسٹوفر بمونٹ (Christopher Beaumont) نے بھی دی ہے۔ بمونٹ تھے تو ریڈ کلف کے سیکرٹری مگر بعد کو انگلستان چلے گئے تھے اور وہاں جج کی حیثیت سے کام کرنے کے بعد ریٹائر ہوئے۔ انہوں نے 1989ء میں برصغیر کی تقسیم کے کوئی بیالیس سال بعد اپنے دستخطوں سے ایک دستاویز آل سولز کالج آکسفورڈ (Allsouls College) کے وارڈن کے حوالے کر کے یہ کہا کہ اسے ان کی وفات کے بعد کھولا جائے اور اس کے مندرجات کے متعلق صرف ان لوگوں کو بتایا جائے جنہیں برطانوی حکومت کے محکمہ خارجہ کے مستقل انڈر سیکرٹری اور وارڈن دونوں مل کر منتخب کریں۔ پھر انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا —— اور اس دستاویز کے مندرجات کا انکشاف اپنی زندگی ہی میں کر دیا۔ سینتالیس کے واقعات پر وقت کی گرد تو جم چکی تھی مگر بمونٹ کو یہ معلوم تھا کہ برطانوی حکومتیں خفیہ دستاویزات کو وقت گزر جانے کے بعد پبلک کے سامنے پیش کر دیا کرتی ہیں۔ وقفہ عام طور پر تیس سال کا ہوتا ہے۔ حکومت برطانیہ نے کچھ پہلے انتقال اقتدار سے متعلق کچھ خفیہ دستاویزات ڈی کلاسی فائی کر کے پبلک کے مطالعے کے لئے پیش کر دی تھیں۔ بمونٹ کو غالباً یہ دھڑکا لگ گیا کہ زیرہ فاضلا اور فیروز پور کے سلسلے میں ان کا لکھا ہوا نوٹ جو سر جارج ایبل نے گورنر پنجاب کے سیکرٹری کو نقشے کے ساتھ بھجوایا تھا خفیہ نہیں رہے گا۔ معروف دانشور حسان ضیاخان کے ساتھ اپنے انٹرویو میں انہوں نے یہ تو تسلیم کر لیا تھا کہ سر جارج ایبل۔ سر این سکاٹ اور خود انہوں نے اس معاملے کو صیغہ راز ہی میں رکھنے کا ارادہ کر رکھا تھا۔ مقصد تو یہ تھا کہ اس کے انکشاف سے دو ملکوں کے تعلقات پر اچھا اثر نہیں پڑے گا۔ یہ محض باتوں کی باتیں ہیں۔ امکان یہ ہے کہ انہیں اپنی ساکھ کے خراب ہو جانے کا خدشہ پیدا ہوا تو انہوں نے کسی اور کی پرواہ کئے بغیر سب کچھ اگل دیا —— ان کا کوئی اور ہمراز تو زندہ نہ رہا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کو

آئرش لبریشن آرمی نے قتل کر دیا تھا۔ سر جارج ایبل دنیا سے رخصت ہو چکے تھے۔ این کاٹ بھی باقی نہ رہے تھے جو کچھ بھی ہوا جیسے بھی ہوا ان کے بیان نے سرل ریڈ کلف ور ماؤنٹ بیٹن کے کردار کی تمام نقاہتوں اور تمام علالتوں کو طشت ازبام کر دیا ہے۔ وہ کہتے ہیں —— سر جارج ایبل کی وفات کے بعد برصغیر کی تقسیم کی حقیقتوں سے واقف ور اس کے رازوں سے شناسا صرف اب میں زندہ رہ گیا ہوں۔ تاریخی صداقتوں کے تحفظ کے لئے ان حقائق کو ریکارڈ پر لے آنا ضروری ہے۔ مگر ابھی ان کی اشاعت مناسب میں۔

میری درخواست ہے۔ اور یہ محض درخواست ہے۔ کہ اس دستاویز کے مندرجات سے میری موت کے بعد آل سولز کالج کے وارڈن اور امور خارجہ کے مستقل انڈر یکرٹری کے اتفاق سے صرف منتخب اشخاص کو آگاہ کیا جائے۔

6 جولائی 1947ء کو سر سرل ریڈ کلف (جو بعد کو لارڈ ریڈ کلف بنا دیئے گئے) کا وَنڈری کمشن کے جائنٹ چیئرمین کی حیثیت سے تقرر ہوا۔

دوسرے ہی دن مجھے ان کا پرائیویٹ سیکرٹری نامزد کر دیا گیا اور جولائی آٹھ کو راؤ صاحب وی ڈی آئر کو اسسٹنٹ سیکرٹری کا عہدہ دے کر کمشن کے ساتھ تعینات کر دیا گیا۔ ان تینوں تقرریوں کا اعلان 28 جولائی کے گزٹ آف انڈیا میں کر دیا گیا جو اس دستاویز کے ساتھ لف کیا جاتا ہے۔ مزید برآں اس دستاویز کے ساتھ وائسرائے کے ڈپٹی سکرٹری این کاٹ کے مجھے لکھے ہوئے تین خط بھی لف ہیں۔ انہیں یہ حقائق مشکوک معلوم ہو رہے تھے۔ میں نے انہیں حقیقت سے روشناس نہیں کرایا۔

جناح۔ نہرو اور ماؤنٹ بیٹن نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ریڈ کلف کو پنجاب اور بنگال کی تقسیم کے متعلق اپنی رپورٹ 15 اگست تک ارسال کرنے کی ہدایت کر دی جائے۔ ریڈ کلف نے اعتراض کیا تھا کیونکہ اتنا بڑا کام صرف ایک مہینہ اور نو دن میں پایہ تکمیل تک نہ پہنچ سکتا تھا۔ ریڈ کلف کا اعتراض مسترد کر دیا گیا۔ اس غیر ذمہ دارانہ فیصلے کا الزام جناح نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کے سر ہے۔

ایک ہندو کو اسسٹنٹ سیکرٹری بنانا (اور یہی کچھ مسلمان اسسٹنٹ سیکرٹری کے متعلق کہا جا سکتا ہے) فاش غلطی تھی۔ (باؤنڈری کمشن کے راز متعلقہ لوگوں تک پہنچنے کا

احتمال تھا) دونوں ملتوں کے درمیان کشمکش میں اضافہ ہو رہا تھا۔ پنجاب اور بنگال میں خونریز فسادات بھی ہوئے تھے۔ آئر برطانوی راج کا وفادار ملازم ضرور تھا۔ مگر راج منظر سے غائب ہو رہا تھا کمشن کا اسسٹنٹ سیکرٹری انگلستان سے درآمد کر لیا جاتا تو بہتر تھا۔

ہندو اور مسلمان ججوں کے اپنا کام مکمل کر لینے کے بعد کمشن کے رازوں سے واقف صرف تین اشخاص تھے اور وہ تھے ریڈ کلف میں اور آئر۔ مجھے یقین ہے کہ آئر نہرو اور وی پی مینن کو کمشن کی تمام خبریں پہنچاتا رہتا تھا۔ اس کی شہادت 12 اگست کو ہونے والی وائسرائے کی میٹنگ سے دستیاب ہے۔ پنڈت نہرو نے چٹاگانگ کے پہاڑی علاقوں کے پاکستان کے حوالے کئے جانے پر اعتراض کیا۔ میں نے ابھی رپورٹ وائسرائے کو نہیں بھجوائی تھی اور نہرو کو اس مجوزہ تفویض کا علم آئر ہی کے ذریعے ہو سکتا تھا۔ اور وائسرائے کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری جان کرسٹی (John Christie) نے 11 اگست کو اپنی ڈائری میں لکھا تھا۔ کہ وائسرائے کو سرل ریڈ کلف کو پنجاب کا خط تقسیم کرنے کے لئے قائل کرنے کی کوشش کرنے سے ہر ممکن طریق سے باز رکھنا ہے (بیومنٹ کی تحریر میں ربط کا فقدان ضرور ہے۔ مگر کچھ اشارے جو بظاہر بے ربط معلوم ہوتے ہیں بعض رازوں کا انکشاف ضرور کرتے ہیں۔ وائسرائے کے اسسٹنٹ پرائیویٹ سیکرٹری کی ڈائری کے ذکر کا تحریر کے متن سے کوئی تعلق تو نظر نہیں آتا۔ مگر اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نے خط تقسیم کی تبدیلی کا اشارہ کہیں ضرور کیا ورنہ جان کرسٹی کو ماؤنٹ بیٹن کو اس حرکت سے باز رکھنے کے لئے یادداشت کے لئے اپنی ڈائری میں اس عزم کے اظہار کی کیا ضرورت تھی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن نہرو کے خط اور بیکانیر کے چیف انجینئر کی دھمکی سے متاثر ضرور ہوئے تھے اور چونکہ معاملہ فیروز پور ہیڈورکس کا تھا اس لئے وہ سرل ریڈ کلف کو اس ضمن میں کچھ کہنا چاہتے تھے)

حقیقت یہ ہے کہ ریڈ کلف نے پنجاب کی تقسیم کا کام مکمل کر لیا تھا۔ فیروز پور پاکستان کے حوالے کیا جاتا تھا۔ پنجاب کے گورنر سرایون جینکنز نے سر جارج ایبل سے درخواست کی تھی کہ اس کے لئے خط تقسیم کے راستے کی نشاندہی کر دی جائے تاکہ تشدد کے انسداد کے لئے حساس جگہوں پر فوج تعینات کی جا سکے۔ سر جارج نے مجھ سے خط تقسیم کے متعلق پوچھا۔ میں نے انہیں تفصیل سے آگاہ کر دیا اور سر جارج نے خط تقسیم

کے راستے کی نشاندہی کے لئے ایک نقشہ بھی بھجوا دیا۔ بدقسمتی یہ ہے کہ سرایون نے یہ نقشہ تلف نہیں کیا جو ان کے لاہور سے رخصت ہو جانے کے بعد پاکستان کی نئی حکومت کے ہاتھ لگ گیا۔ پاکستان کو یہ شبہ ہو گیا (اور وہ اس میں حق بجانب بھی تھا) کہ ریڈ کلف نے ماؤنٹ بیٹن کے دباؤ پر یہ تبدیلی کی ہے۔ ماؤنٹ بیٹن پر نہرو اور بیکانیر کا دباؤ تھا۔ کیونکہ فیروزپور ہیڈورکس کے پاکستان کی تحویل میں چلے جانے سے بیکانیر کو نقصان کا احتمال تھا۔

میں اور ریڈ کلف وائسرائے کی ملک میں رہائش پذیر تھے۔ غالباً یہ گیارہ اگست کی رات تھی۔ آدھی رات کے قریب نہرو کے بعد ہندوستانی سیاست کے دوسرے اہم ستون وی پی مینن باہر کے دروازے پر نمودار ہوئے۔ ریڈ کلف کام میں مصروف تھے۔ وہ اندر آئے اور مجھ سے ریڈ کلف سے ملنے کی اجازت چاہی۔ میں نے نرمی سے انہیں سمجھانے کی کوشش کی اور کہا کہ وہ ریڈ کلف سے نہیں مل سکتے (بیومنٹ صاحب اس ضمن میں معلوم ہوتا ہے مبالغے سے کام لے رہے ہیں کیونکہ وائسرائے کے عملے سے لوگوں کے ریڈ کلف کے پاس آنے کے کچھ واقعات کا ذکر ضرور ہوا ہے۔ لارڈ اسے کا ان کے پاس آنا تو بہر طور ثابت ہوتا ہے۔ اور وائسرائے کی اسٹیٹ میں رہتے ہوئے وائسرائے اور ان کے عملے سے الگ رہنا آسان نہ تھا۔ ریڈ کلف کو قید تنہائی کی سزا تو نہیں دی گئی تھی)

وی پی مینن نے بیومنٹ کو بتایا کہ انہیں ماؤنٹ بیٹن نے بھیجا ہے۔ میں نے پھر بھی ان کی بات نہ مانی۔ وہ چپ چاپ واپس چلے گئے۔ دوسرے دن ناشتے کی میز پر میں نے ریڈ کلف کو سارا قصہ سنایا۔ وہ خاموش رہے۔ انہوں نے بات سن کے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ اس دن مجھے ریڈ کلف نے بتایا کہ ماؤنٹ بیٹن کے چیف آف سٹاف لارڈ اسے نے انہیں دوپہر کے کھانے پر بلایا تھا۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ میں تمہیں اپنے ساتھ نہ لاؤں۔ اس کا جواز یہ بیان کیا گیا تھا کہ فاضل مہمان کے لئے میز پر جگہ نہ ہو گی۔ میں نے اسے کے ساتھ چھ مہینے اس کے مکان میں گزارے تھے۔ مجھے معلوم تھا کہ مجھے نہ بلانے کے لئے پیش کیا جانے والا جواز فریب ہے۔ مگر اسے کی اس حرکت نے میرے دل میں شبہات پیدا نہیں کئے۔ مجھے اگلے ہفتے ہندوستان سے رخصت ہونا تھا۔ میں اپنی مصروفیتوں میں گم ہو گیا۔

اسی شام پنجاب کا خط تقسیم تبدیل کر دیا گیا۔ اور فیروز پور ہندوستان کو تفویض کر دیا گیا۔ البتہ گورداسپور اور بنگال کی تقسیم کو چھیڑا نہیں گیا —— یوں ماؤنٹ بیٹن فریب دہی کا مرتکب ہوا۔ اور ریڈ کلف نے بھی اپنے آپ کو اس فریب دہی میں شریک کر لیا۔

اس زمانے کے حالات ماؤنٹ بیٹن کے جرم کی تخفیف ضرور کرتے ہیں۔ ماؤنٹ بیٹن بے حد مصروف تھا۔ اور نہرو اور وی پی مینن نے اس سے یہ ضرور کہا ہو گا کہ فیروزپور کو پاکستان کی تحویل میں دینے سے دونوں ملکوں کے درمیان جنگ چھڑ جائے گی امکان یہ ہے کہ بیکانیر کے مہاراجہ نے بھی کردار ادا کیا۔ وہ ماؤنٹ بیٹن کا قریبی دوست تھا۔ اور فیروزپور ہیڈ ورکس اس کی ریاست کے لئے خصوصی اہمیت کے حامل تھے۔ اور ماؤنٹ بیٹن نہرو کو پسند اور جناح کو ناپسند کرتا تھا۔

ریڈ کلف کو اسے اور ماؤنٹ بیٹن نے اپنا ہم خیال بنا لیا اور یہ سب کچھ دوپہر کے اس کھانے پر ہوا جس کے لئے مجھے مدعو نہیں کیا گیا تھا۔ فیروزپور اس قدر اہم تھا کہ اس کی مسلم اکثریت کے باوجود اسے پاکستان کے حوالے کرنے سے خانہ جنگی ہو سکتی تھی۔

ریڈ کلف کو ہندوستان میں آئے صرف چھ ہفتے ہوئے تھے۔ اس سے پہلے اسے کبھی جبل الطارق کے شرق میں جانے کا موقع نہیں ملا تھا۔ اسے شاید یہ معلوم نہیں تھا کہ مینن اور نہرو ماؤنٹ بیٹن پر دباؤ ڈال رہے ہیں۔ انہوں نے ماؤنٹ بیٹن کی بات مان لی —— اگر سر ایون اس نقشے کو تلف کر دیتے تو حکومت پاکستان کی اس تبدیلی کا کبھی علم نہ ہوتا۔ یہ واقعہ نہرو اور ماؤنٹ بیٹن کے لئے بہت بڑا ڈس کریڈٹ ہے۔ ریڈ کلف کا جرم یقیناً کم ہے۔

اس کے ساتھ ہی ماؤنٹ بیٹن کے عملے کے اہم رکن سر این سکاٹ کا بومونٹ کے نام ایک خط ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اس ضمن میں بومونٹ کی شہادت کے علاوہ مزید تائیدی شہادتیں بھی موجود ہیں۔ اس پائلٹ کے پاس جسے ریڈ کلف کو ماؤنٹ بیٹن کے جہاز میں پنجاب کی ممکنہ حد بندی کے ملاحظے کے لئے لے کے جانا تھا کے پاس بھی اس تقسیم کا ایک نقشہ موجود تھا (ہوا یوں تھا کہ ریڈ کلف ماؤنٹ بیٹن کے جہاز میں پنجاب کے علاقوں پر پرواز کرنے کے لئے لاہور آئے تھے۔ وہ اس ہوائی سفر پر تنہا جانے کے خواہش

مند تھے۔ پھر ایک مسلمان اور ایک ہندو نمائندے کو اپنے ساتھ لے جانے کے لئے راضی ہو گئے۔ جب جسٹس منیر جو پنجاب باؤنڈری کمیشن میں مسلم لیگ کے نمائندے کی حیثیت سے کام کر رہے تھے ہوائی سفر کے لئے پہنچے تو معلوم ہوا کہ پرواز منسوخ کر دی گئی ہے کیونکہ ان علاقوں پر جن کی ساحت اس پرواز کا مقصد تھی دھول کے گہرے بادل تھے اور کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ پائلٹ سے پرواز کے متعلق پوچھا گیا تو اس نے اس خط تقسیم پر پرواز کرنے کا اشارہ کیا۔ جو اس نقشے سے مختلف تھا جسے بومونٹ نے جارج ایبل کو بھجوایا تھا۔ این سکاٹ یہ کہنا چاہتے تھے کہ خط تقسیم بعد کو تبدیل کر دیا گیا۔) ماؤنٹ بیٹن نے 22 جولائی کو لاہور میں پنجاب کے کمشنروں کے اجلاس میں شرکت کی تھی۔ اس لئے رونی بروکمین (Ronnie Brockman) اور کیمپل جانسن (Campbell Johnson) کا یہ دعویٰ کہ ماؤنٹ بیٹن ان امور میں دلچسپی نہ لیتے تھے صریحاً غلط ہے۔ اور سر جارج ایبل کا پنجاب گورنر کے سیکرٹری سٹیورٹ ایبٹ (Stewart Abbot) کو اس نقشے کی ترسیل اس کانفرنس کے فیصلے کے مطابق تھی جس میں کہا گیا تھا کہ ایون جینکنز کو خط تقسیم کے راستے کی جتنی جلدی ممکن ہو سکے اطلاع کر دینی چاہئے تاکہ وہ فوج اور پولیس کی ترتیب مکمل کر سکے (اور این سکاٹ کے کہنے کے مطابق وہ خود اس کانفرنس میں موجود تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ گورنر پنجاب ایون جینکنز کی رخصت کے بعد جب یہ نقشہ حکومت پاکستان کے ہاتھ لگا تو اس کی گورنر کے پاس موجودگی کی بے شمار وضاحتیں کی گئیں۔ کہا گیا کہ ایبل نے یہ نقشہ ماؤنٹ بیٹن کی اجازت کے بغیر گورنر پنجاب کو بھجوا دیا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن کو اس کا علم ہی نہیں تھا۔ عذر گناہ بدتر از گناہ۔ نقشے کی صداقت کو جھٹلایا ہی نہیں جا سکتا۔ یہ کہہ دینا کہ ماؤنٹ بیٹن کو اس کا علم نہ تھا۔ اس گناہ پر پردہ نہیں ڈال سکتا جو سرزد ہوا۔ یہ نقشہ جارج ایبل نے تیار نہیں کیا تھا۔ یہ نقشہ تو اس نے ریڈ کلف کے سیکرٹری سے حاصل کیا تھا اور ریڈ کلف کے سیکرٹری کی طرف سے نقشے کے ساتھ ایک مختصر یادداشت بھی دی گئی تھی۔ اگر یہ نقشہ غلط تھا تو اسے کس نے تیار کیا۔ اور اگر غلط نہیں تھا تبدیل کیوں کیا گیا۔ انگریز مصنفین نے ماؤنٹ بیٹن کے گناہ پر پردہ ڈالنے کی کوشش ضرور کی ہے۔ مگر ان کی کوشش بری طرح ناکام ہوئی ہے انہوں نے ماؤنٹ بیٹن کے جسم سے رہے سہے کپڑے بھی اتار لئے ہیں اور اسے بالکل ننگا کر دیا ہے)

این سکاٹ نے لکھا ہے کہ جینکنز نے دہلی سے نقشہ وصول ہونے پر اپنے پانچوں ڈپٹی کمشنروں کو خط تقسیم کے متعلق آگاہ کر دیا ــــــ ان پانچوں میں سے ایک ہندو تھا۔ اس نے اپنے ہندو انجینئر کو اپنا صدر دفتر فیروزپور سے کسی اور جگہ منتقل کرنے کی ہدایت کی۔ اس شخص نے بیکانیر کے چیف انجینئر کو خبر دی۔ اس نے مہاراجہ کو مطلع کیا اور دوسرے ہی دن دہلی پہنچ گئیں اور ماؤنٹ بیٹن کی ملاقات کے لئے اور لوگ بھی آ پہنچے۔ این سکاٹ کے کہنے کے مطابق اس قصے کا ایک اور اہم پہلو بھی ہے اور وہ یہ کہ 9 اگست تک ماؤنٹ بیٹن ریڈ کلف پر کام جلدی ختم کرنے کے لئے دباؤ ڈالتا رہا تاکہ تقسیم کا اعلان پندرہ اگست سے قبل کیا جا سکے۔ مگر اس واقعے کے بعد اس نے اپنا راستہ تبدیل کر لیا۔ (این سکاٹ نے اپنے خط میں بیک پیڈل (Backpedal) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ ڈکشنری میں اس کا مطلب ہے پیڈلوں کو پیچھے گھما کے سائیکل کی رفتار کو سست کر دینا) اور غیر صحیح مگر بظاہر صحیح نظر آنے والی وجوہ پر اسے اس لئے موخر کر دیا گیا کہ آزادی سے قبل اس اعلان سے لاتعداد مسائل پیدا ہو جائیں گے۔ ماؤنٹ بیٹن نے عملے کی ایک میٹنگ میں اس کا اعلان بھی کیا۔ اور لارڈ اسمے (Ismay) نے جو عام طور پر اس وقت زبان کھولتے تھے جب میٹنگ ختم ہونے والی ہوتی تھی اس دن خلاف توقع اعلان کو موخر کرنے کے فیصلے پر ماؤنٹ بیٹن کی تائید بھی کی تھی۔ اور قہر تو یہ ہے کہ اپریل 1950ء میں ماؤنٹ بیٹن نے اس نقشے کے سلسلے میں لندن پہنچ کر کابینہ کے اراکین کے سامنے جارج ایبل پر بیوفائی کا الزام بھی لگایا۔ یہ ایک سراسر مہمل اتہام تھا جس کا حقیقت سے دور کا تعلق بھی نہ تھا ــــــ

سر این سکاٹ (Sir Ian Scott) نے مندرجہ بالا خط کرسٹو فر بمونٹ کو 29 فروری 1992ء کو لکھا اور بمونٹ کا اپنا بیان جو اس نے واڈن آل سولز کالج کے حوالے کیا 20 ستمبر 1989ء کو لکھا گیا ــــــ ان لوگوں کے بیانات میں جنہوں نے ان بدعنوانیوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ تقسیم کے سلسلے میں ہونے والے اس گھپلے کے متعلق اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے۔ یہ لوگ سازش میں شریک نہیں تھے مگر قریب سے اس کا مشاہدہ کر رہے تھے۔ یہ ان کے اپنے ضمیر کی بات ہے کہ انہوں نے اس وقت اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا۔ یوں خاموش رہے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ ان کی خاموشی سے

انہیں ایک انداز سے سازش کا حصہ ضرور بنا دیا۔ انہوں نے اپنے دامن پر لگے داغوں کو دھونے کی کوشش کی ہے۔ ان کا دامن اب بھی داغدار ہے کہ نہیں اس کے متعلق مختلف آراء ہو سکتی ہیں۔

ریڈ کلف کا ایوارڈ۔ بنگال اور پنجاب دونوں صوبوں کے متعلق سنگدلانہ جانبداری کا مظاہرہ ہے۔ بنگال میں جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے مرشد آباد کا ضلع جہاں کل آبادی 1640530 نفوس پر مشتمل تھی مسلمان جو کل آبادی کے 56.55 فیصد کے برابر تھی ہندوستان کو دے دیا گیا۔ نادیہ ضلع کا دو تہائی حصہ جس کی کل آبادی 1759856 تھی اور مسلمان کل آبادی کا 61.26 فیصد تھے۔ بونی گاؤں اور گنگھاٹا کے دو تھانے (بونی گاؤں میں مسلمان کل آبادی کا 56.4 فیصد تھے) اور گنگھاٹا میں ان کا تناسب 61.5 فیصد تھا مغربی بنگال کی تحویل میں دے دیئے گئے۔ مقصد یہ تھا کہ پاکستانی علاقے کو بھاگیرتی ہگلی دریا سے جس پر کلکتہ کی بندرگاہ تھی دور رکھا جا سکے۔ ریڈ کلف کو یہ خدشہ تھا کہ پاکستان اس دریا کے بہاؤ کو روکنے کی کوشش کرے گا اور چرنی اور جلنگی جیسے چھوٹے دریاؤں کا رخ موڑ کے کلکتہ کی بندرگاہ کو برباد کر دے گا۔ کلکتہ کے متعلق تو فیصلہ ہو ہی چکا تھا۔ سردار پٹیل نے واشگاف الفاظ میں تقسیم کے بعد یہ اعلان کر دیا تھا کہ ہم نے برصغیر کی تقسیم کو اس شرط پر تسلیم کیا تھا کہ کلکتہ بہرصورت ہندوستان کے حوالے کیا جائے گا۔ چنانچہ کلکتہ کی بندرگاہ کو ممکنہ نقصانات سے محفوظ رکھنے کے لئے قرب و جوار کے تمام علاقے ہندوستان کو دے دیئے ریڈ کلف پہلی بار برصغیر آئے تھے۔ انہیں نہ تو بنگال اور نہ اس کے معاون دریاؤں کا علم تھا۔ انہیں یہ بات کسی نے سمجھائی۔ اور ان سے مرشد آباد۔ نادیہ اور دوسرے علاقے جن کے کلکتہ کی بندرگاہ پر ممکنہ اثرات کو بنگال کے لوگ بھی جانتے تھے ماہرین کی رائے کے مطابق ہندوستان کو دلوائے گئے۔ ریڈ کلف وکیل تھے۔ مگر کلکتہ کے متعلق ان کا اپنا اعتراف اس امر کا غماز ہے کہ ماہر انجینئروں نے ان کی رہنمائی کی۔

اس کے علاوہ ریڈ کلف نے مسلم اکثریت کے ضلع مالدا کا دو تہائی (کل آبادی 1232618 ــــــ مسلم آبادی کا تناسب 56.78 فیصد) اور نصف کے قریب ضلع دیناج پور کا علاقہ (آبادی 1926533 ــــــ مسلمان آبادی کا تناسب 50.20 فیصد) ہندوستان کے حوالے کر دیئے۔ ریڈ کلف کے ایوارڈ نے بنگال اور آسام کی آبادی کا 60 فیصد تو

مشرقی بنگال کو دے دیا مگر رقبہ صرف چالیس فیصد مشرقی پاکستان کو دیا گیا۔ وہ علاقے خاص طور پر مرشد آباد جو اسلامی تہذیب و ثقافت کا مرکز رہا ہے بیک جنبش قلم مسلمانوں سے چھین لیا گیا۔

ریڈکلف کی اس "غیر جانبداری" کا مظاہرہ پنجاب کی تقسیم میں بھی کیا گیا۔ گورداسپور کے ضلع سے غیر مسلم اکثریت کی پٹھانکوٹ تحصیل کی ہندوستان کی سپردگی تو درست تھی مگر گورداسپور اور بٹالہ کی تحصیلوں کا پاکستان سے الگ کر دینا ناقابل فہم ہے۔ تحصیل گورداسپور کی کل آبادی 328819 میں سے مسلمانوں کی آبادی کا تناسب 52.16 فیصد تھا۔ اور بٹالہ کی کل آبادی 380053 میں 55.07 فیصد مسلمان تھے۔ یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے مطابق کشمیر کا ہندوستان سے زمینی رابطہ قائم کرنے کے لئے کیا گیا تھا۔ اس سے پہلے ہندوستان اور کشمیر کے درمیان بلند و بالا پہاڑوں کا ایک ناقابل گزر سلسلہ تھا۔ کشمیر کی ڈاک، کشمیر کے لئے کھانے پینے کی اشیاء۔ کشمیر کی ہر چیز ان راستوں سے کشمیر پہنچتی تھی جو پاکستان کے علاقے میں تھے۔ تحصیل بٹالہ اور تحصیل گورداسپور کو ہندوستان کے حوالے کئے بغیر ہندوستان کا کشمیر سے کوئی زمینی علاقہ نہ تھا۔

ایلسٹیر لیمب (Alastair Lamb) نے انتقال اقتدار کے متعلق برطانوی حکومت کی طرف سے ڈی کلاسی فائی (وہ دستاویزات جو پہلے خفیہ ہوں اور بعد میں اس زمرے سے خارج کر دی گئی ہوں۔ جنہیں عام لوگ بھی دیکھ سکتے ہوں) کی جانے والی کچھ دستاویزات کا جزوی تجزیہ کیا ہے۔ جناب حسان ضیا کہتے ہیں کہ ان دستاویزات کے تجزیے سے لیمب اس نتیجے پر پہنچے ہیں اور انہوں نے اس کا ذکر اپنی تصنیف "کشمیر۔ ایک متنازع ترکہ" (Kashmir Adisputed Legacy) میں کیا ہے کہ کشمیر کا معاملہ اپریل 1947ء ہی میں ہندوستان زعماء اور برطانوی حکومت کے زیر بحث تھا۔ قائداعظم اور مسلم لیگ کو اس گفت و شنید میں شریک نہیں کیا گیا تھا۔ اور انہیں اس کے متعلق کچھ نہیں بتایا گیا تھا۔ لیمب کو یہ یقین ہے کہ جون 1947ء میں کشمیر کی تقدیر کا فیصلہ کر دیا گیا تھا۔ اور یہ طے کر لیا گیا تھا کہ کشمیر کا الحاق ہندوستان سے ہو گا۔ خیال یہ تھا کہ ہندوستان پاکستان سے زیادہ طاقتور ملک ہونے کی وجہ سے سوویت یونین کے عزائم کا مقابلہ کر سکے گا اس فیصلے کو عملی جامہ پہنانے کے لئے گورداسپور اور بٹالہ کی تحصیلوں کا ہندوستان کے سپرد کیا جانا ضروری

تھا۔ اس کے بغیر ہندوستان کا کشمیر سے زمینی رابطہ قائم نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر لیمب کا یہ تجزیہ درست ہے تو ریڈکلف کو اس کی برصغیر میں آمد سے قبل ہدایت نامہ جاری کیا گیا ہو گا۔ سدھیر گھوش۔ کرشنا مینن نہرو اور پٹیل کو علم ہو گا۔ ممکن ہے مہاتما گاندھی کو بھی باخبر رکھا گیا ہو اور شاید مہاتما کا ماؤنٹ بیٹن سے دو ہی ملاقاتوں کے بعد تقسیم کو تسلیم کر لینا اسی پلان کا شاخسانہ ہو۔

ریڈکلف نے پنجاب کے بیشتر مسلم اکثریتی علاقے ہندوستان کو دے دیئے۔ مگر پاکستان کو ان کے عوض کچھ نہیں دیا بلکہ مسلمان اکثریت کے علاقے بھی ہندوستان کو دے دیئے گئے۔ اس ضمن میں درج ذیل مثالیں پیش کی جا سکتی ہیں۔

تحصیل	کل آبادی	مسلم اکثریت
فیروزپور تحصیل	290286	55.25 فیصد
زیرہ تحصیل	210819	65.26 فیصد
اجنالہ تحصیل	237049	59.46 فیصد
جالندھر تحصیل	443010	51.50 فیصد
نکودر تحصیل	228783	59.41 فیصد
فاضلکا تحصیل		75.12 فیصد
[illegible] تحصیل		66.56 فیصد
جگراؤں تحصیل		69.32 فیصد
لدھیانہ تحصیل		68.59 فیصد
نواں شہر تحصیل		50.99 فیصد
پھلور تحصیل		67.24 فیصد
تھانہ بھیٹو (تحصیل امرتسر)		51.9 فیصد

اور دلیل یہ پیش کی کہ مغربی پنجاب کی سرحد کو ستلج کے مشرق تک بڑھانا دونوں میں کسی ریاست کے لئے سود مند نہ تھا۔ اور اس سے ریلوے مواصلات برہم ہو جاتے تھے۔ ریڈکلف کو اپنا زیادہ وقت کلکتہ اور لاہور میں گزارنا چاہئے تھا جہاں بنگال اور پنجاب کے باؤنڈری کمشن مصروف کار تھے۔ مگر انہوں نے سارا وقت وائسرائے کے محل میں

گزارا۔ ریڈکلف کی زیادتیوں کا معاملہ اقوام متحدہ کی سیکیورٹی کاؤنسل میں بھی پیش ہوا۔ انگریزوں کو علم تھا کہ بات اگر چل نکلی تو ان کی غیر جانبداری کا بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ انہوں نے وضاحت کر کے معاملہ دبا دیا۔

اور پھر پنجاب میں فسادات کے متعلق ماؤنٹ بیٹن کی خاموشی بھی معنی خیز تھی۔ انہیں اطلاعات مل رہی تھیں۔ پنجاب کے گورنر انہیں ان کے وزیر دفاع سردار بلدیو سنگھ کی حرکتوں سے آگاہ کر رہے تھے۔ سکھ اور ہندو ریاستوں کے حکمران مسلمانوں کے خلاف تشدد پسندوں کی اعانت کر رہے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن کو سب کچھ معلوم تھا مگر وہ اس سلسلے میں کوئی اقدام نہیں اٹھا رہے تھے۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان کی معمولی سی سرزنش ریاستوں کے حکمرانوں کو ان حرکات سے اجتناب کرنے پر مجبور کر سکتی تھی۔ ریاستوں کے حکمران وائسرائے سے ڈرتے تھے اور اس کی حکم عدولی کر ہی نہیں سکتے تھے۔ فریڈم ایٹ مڈنائٹ (Freedom at Mid Night) کے مصنفین لیری کولنز (Larry Collins) اور ڈومینیک لاپئر (Dominique Lapierre) نے مہاراجہ جودھ پور کے متعلق ایک ایسے واقعے کا ذکر کیا ہے جس سے وائسرائے کے لامحدود اختیارات اور راجوں مہاراجوں کی اطاعت گزاری کا پتہ چلتا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ مہاراجہ جودھ پور اور مہاراجہ جیلسیر قائداعظم کے ساتھ دہلی میں ایک خفیہ ملاقات کے بعد ان کی طرف سے دی جانے والی مراعات سے مطمئن ہو کر پاکستان کے ساتھ الحاق کے متعلق سوچنے لگے۔ وی پی مینن کو نجانے کیسے اس بات کا پتہ چل گیا۔ مینن مہاراجہ جودھ پور کو لے کر (مہاراجہ سے یہ کہا کہ وائسرائے اس سے ملنا چاہتے ہیں) وائسرائے کے ایوان میں جا پہنچا۔ مہاراجہ جودھ پور انتظار گاہ میں بیٹھ کر وائسرائے کے احکام کا انتظار کرنے لگے۔ مینن ماؤنٹ بیٹن کے پاس جا پہنچا اور مہاراجہ جودھپور کے ارادے سے اس کو آگاہ کیا۔ ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ جودھپور کو ہندو ریاست کے پاکستان کے ساتھ الحاق سے منع کیا اور یہ بھی کہا کہ تمہارا آنجہانی والد تمہاری اس قبیح حرکت پر سخت برہم ہوتا۔ مہاراجہ جودھ پور سے کوئی جواب نہ بن پایا۔ ماؤنٹ بیٹن نے اسی وقت مینن سے کہہ کر جودھ پور کے ہندوستان سے وقتی الحاق کی دستاویز پر دستخط کرا لئے۔ تین دن کے بعد مینن پکی دستاویز لے کر مہاراجہ کے محل میں جا حاضر ہوا۔ اور مہاراجہ نے چپ چاپ دستاویز پر

دستخط کر دیئے۔

وائسرائے کا احترام وہی حکمرانوں کی سرشت میں تھا۔ اس کا خوف ان کے اعصاب پر قابض تھا۔ وہ اس کی ہدایت کو ٹال نہیں سکتے تھے۔ ماؤنٹ بیٹن ماتھے پر شکن ڈال کے ان کی طرف دیکھتے تو ان کے دل دہل جاتے اور وہ انکار کی کبھی جرات نہ کرتے۔

5 اگست 1947ء کو پنجاب کے گورنر نے پنجاب سی آئی ڈی کے ایک افسر کیپٹن سیویج (Savage) کو اس کی اپنی خصوصی رپورٹ ماؤنٹ بیٹن تک پہنچانے کے لئے دہلی بھیجا۔ سیویج کی رپورٹ یہ تھی کہ ماسٹر تارا سنگھ فوج کے سکھ افسروں کی وساطت سے اسلحہ اکٹھا کر کے سکھ ریاستوں میں خفیہ مقامات پر جمع کر رہا ہے۔ مہاراجہ فرید کوٹ نے اسے ٹرانسپورٹ مہیا کر رکھی ہے۔ اسے یہ بھی اطلاع ملی تھی کہ تارا سنگھ کی ہدایت کے مطابق چار پانچ سو سکھ پاکستان جانے والی سپیشل ٹرین کو ریموٹ کنٹرول سے اڑانے کا پروگرام مرتب کر رہے ہیں۔ سیویج نے یہ بھی بتایا کہ قائداعظم کو کراچی میں آزادی کی تقریب میں ہلاک کرنے کا منصوبہ بھی بنایا گیا ہے۔ ماسٹر تارا سنگھ فیروزپور ہیڈورکس کو تباہ کرنے کے لئے بم بھی اکٹھے کر رہے ہیں۔

سیویج نے جس وقت یہ رپورٹ ماؤنٹ بیٹن کو دی اس وقت قائداعظم، لیاقت علی خاں اور سردار پٹیل بھی موجود تھے۔ قائداعظم نے سکھ رہنماؤں کی فوری گرفتاری کا مطالبہ کیا۔ سردار پٹیل نے مخالفت کی۔ فیصلہ یہ ہوا کہ ریڈ کلف کے ایوارڈ کے اعلان کے ساتھ ہی جو دس اگست کو متوقع تھا سکھ رہنماؤں کو گرفتار کر لیا جائے گا۔ مغربی پنجاب کے گورنر کو سکھ رہنماؤں کی گرفتاری کے متعلق ہدایات جاری کر دی گئیں۔ مشرقی پنجاب کے گورنر ترویدی (Trivedi) سے بھی مشورہ کیا گیا۔ اس نے پٹیل سے بات کی اور اس کی نصیحت پر ان رہنماؤں کو گرفتار کرنے سے انکار کر دیا۔ پنجاب کے گورنر نے بھی ترویدی سے بات کی اور وہ بھی پس و پیش کرنے لگا۔ سکھ رہنماؤں کو گرفتار نہ کرنے کی سفارش کی گئی۔ ماؤنٹ بیٹن نے یہ سفارش مان لی اور حکم دے دیا کہ پالیسی کی تبدیلی کے متعلق قائداعظم کو کوئی اطلاع نہ دی جائے۔

اس کے صرف ایک ہی دن بعد دہلی کے لال قلعے میں ایک تقریب ہوئی۔ ہندوستان کی فوج کے افسروں نے پاکستانی فوج کے افسروں کو الوداعی پارٹی دی۔ سردار بلدیو سنگھ،

پنڈت نہرو' ہندوستانی فوج کے نام گذار کمانڈر انچیف جنرل کیری اپا (Cariappa) بھی اس تقریب میں شریک ہوئے۔ تین دن کے بعد ——— اس پارٹی میں شریک ہونے والے چار مسلمان فوجی افسر جو ٹرین کے ذریعہ پاکستان جا رہے تھے ٹرین ہی میں قتل کر دیئے گئے اس ٹرین میں سوار ڈیڑھ سو مسلمان فوجی اور ان کے اہل و عیال بھی موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے اور اسی دن مسلمانوں کے خلاف منظم یلغار کا آغاز کر دیا گیا۔ پھر پاکستان جانے والی ایک ریل گاڑی پٹڑی سے اتر گئی۔ ماؤنٹ بیٹن کو اطلاع دی گئی کہ یہ کام بھی سکھ تخریب کاروں کا ہے۔ ان کی جیپ کا پیچھا کیا گیا مگر وہ فرید کوٹ کی حدود میں گم ہو گئی۔ ماؤنٹ بیٹن کو یہ بھی بتایا گیا کہ ایک ہندو پولیس افسر نے امرتسر پہنچتے ہی امرتسر پولیس کے مسلمان ارکان سے اسلحہ واپس لے لیا ہے۔ وہ نہتے ہیں۔ اپنی حفاظت نہیں کر سکتے۔ دوسروں کی حفاظت کیا کریں گے۔

مشرقی پنجاب کے مسلمانوں کو اپنے گھروں سے نکلنے پر مجبور کر دیا گیا۔ وہ اپنا سب کچھ چھوڑ کر پناہ کی تلاش میں پاکستان کی طرف چل کھڑے ہوئے۔ ان کے قافلوں پر منظم حملے کیے گئے۔ مرد قتل کر دیئے گئے۔ عورتیں اغوا کر لی گئیں۔ اتنا خون بہا کہ دریا سرخ ہو گئے۔ زمین سیراب ہو گئی۔ گدھوں' کوؤں اور چیلوں کو صدیوں کے بعد اتنے بہت سے انسانوں کا گوشت کھانے کو ملا ——— ریڈکلف کے ایوارڈ کے اعلان نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔ ان علاقوں میں بھی گڑ بڑ شروع ہو گئی جہاں اس سے پہلے نسبتاً سکون تھا ——— صوبہ جات متوسط کے ایک سابق انگریز گورنر نے یہ سب کچھ دیکھ کر کہا کہ پنجاب کو اس قتل و غارت' لوٹ مار اور آتشزنی نے تیمور لنگ کے زمانے میں دھکیل دیا ہے ہندوستان کی ایک عدالت عالیہ کے جج جی ڈی کھوسلہ نے کہا کہ پانچ لاکھ کے قریب انسان مارے گئے۔ اقوام متحدہ کی سلامتی کاؤنسل کو پاکستان کے وزیر خارجہ نے بتایا کہ سکھوں کے منصوبے کے متعلق اطلاعات تو مل رہی تھیں اور وائسرائے لارڈ ماؤنٹ بیٹن کو اس منصوبے کا علم تھا۔ پنجاب کی حکومت کی طرف سے مرکزی حکومت کو بھجوائی جانے والی رپورٹوں سے یہ واضح ہوتا ہے کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن سکھوں کے منصوبے سے آگاہ تھے۔ لارڈ ماؤنٹ بیٹن کی خاموشی اور عدم توجہی سے برطانوی حکومت چونکہ اقوام متحدہ میں بدنام ہو رہی تھی اس لئے پاکستان کے وزیر خارجہ سے اس معاملے کو پھر سے نہ

اٹھانے کا وعدہ لے لیا گیا ——— حکومت پاکستان نے یہ درخواست مان لی اور اس معاملے کو سلامتی کاؤنسل میں پھر اٹھایا نہیں گیا۔

فرڈم ایٹ مڈنائٹ کے مصنفین کہتے ہیں کہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن قائداعظم کو کھلی کار میں آزادی کی تقریب میں شمولیت سے منع کرتے رہے۔ مگر انہوں نے اسے اپنی قوم کی توہین سمجھ کر ماؤنٹ بیٹن کی بات ماننے سے انکار کر دیا۔ وہ کھلی کار میں تقریب میں شریک ہوئے۔ ماؤنٹ بیٹن ان کے ہمراہ تھے۔ جب دونوں قائداعظم کی قیام گاہ میں پہنچے تو ماؤنٹ بیٹن نے مسکرا کے قائداعظم سے کہا۔

"آپ میری وجہ سے زندہ سلامت واپس آ رہے ہیں ———"

حقیقت یہ ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کی صحیح سلامت واپسی بھی قائد ہی کی مرہون منت تھی۔ اس ہجوم میں کوئی شخص قائداعظم پر حملہ کرنے کی جرات نہ کر سکتا تھا۔

قائداعظم نے کہا ———

ہندوستان کی حتمی اور رجعت ناپذیر تقسیم ہو چکی ہے۔ اس میں شک نہیں کہ اس عظیم مسلمان سلطنت کے قیام کے سلسلے میں ناانصافیاں ہوئی ہیں۔ ہمیں بری طرح بھینچ دیا گیا ہے (افسردہ کر دیا گیا ہے) ہم پر آخری ضرب باؤنڈری کمشن کے ایوارڈ کی صورت میں لگائی گئی ہے۔ یہ ایک بے انصاف۔ ناممکن الفہم۔ بلکہ متمرد فیصلہ ہے۔ یہ غلط ہو۔ بے انصاف ہو۔ متمرد ہو۔ عدالتی نہیں سیاسی فیصلہ ہو۔ ہمیں ایک معزز محترم اور مشرف قوم کی طرح اسے تسلیم کرنا ہے۔ ہم اس کے پابند ہیں۔ یہ ہماری بدقسمتی ہو سکتی ہے مگر ہمیں اس ضرب کو حوصلے امید اور استقلال کے ساتھ برداشت کرنا ہے۔

پنجاب کے فسادات نے قائداعظم کو پریشان کر رکھا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن سے شکایت کی جا رہی تھی مگر ماؤنٹ بیٹن ان شکایات میں دلچسپی نہیں لے رہے تھے۔ کلکتہ کے متعلق انہوں نے مناسب انتظام کر رکھے تھے۔ پنڈت نہرو نے وسط جولائی میں اپنے اس خدشے کا اظہار ماؤنٹ بیٹن سے گفتگو کے دوران کیا تھا کہ مسلمان کلکتہ کو تاراج کر دیں گے۔ ماؤنٹ بیٹن نے گورنر سے بات کی تھی اور گورنر نے کہا تھا کہ کلکتہ کو ہر قسم کا تحفظ فراہم کرنے کے انتظامات مکمل کر لئے گئے ہیں اور ماؤنٹ بیٹن نے یکم اگست کو ریڈکلف کے ایوارڈ کے اعلان سے سولہ دن پہلے سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا کو یہ اطلاع دی کہ

کلکتہ کے دفاع کے لئے فوجی منصوبے تیار کر لئے گئے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ فوج کلکتہ کو تاراج نہیں ہونے دے گی۔

کیا سیکرٹری آف سٹیٹ اور ماؤنٹ بیٹن کو کلکتہ کے مستقبل کا پہلے سے علم نہیں تھا۔؟؟

حقیقت اور افسانہ

اپنا میرا رشتہ دیکھیں اتنی جسارت یاد کریں
پشت پہ زخم لگاتے ہیں وہ سامنے آ کے وار کریں

ماؤنٹ بیٹن نے جن کے لئے اپنے کردار کو داغدار بنایا ان لوگوں نے اس کا بھرم نہیں رہنے دیا۔ اپنا کام نکالا اسے خوش کرنے کے لئے آزاد ہندوستان کا پہلا گورنر جنرل بنا دیا۔ وہ گیا اور اس کے جاتے ہی وہ تمام راز افشا کر دیئے جو پوشیدہ رہ جاتے تو اس کے وقار۔ اس کی آبرو اور نیک نامی پر کوئی حرف نہ آتا ——— مگر ان کے انکبار کا یہ عالم تھا کہ انہوں نے اپنے محسن کی آبرو کی بھی دھجیاں بکھیر دیں۔ شاید وہ یہ سوچ رہے تھے کہ احسان ان پر ماؤنٹ بیٹن کا نہیں بلکہ ماؤنٹ بیٹن پر ان کا ہے کیونکہ ماؤنٹ انہی کی سفارش پر برصغیر کے وائسرائے بنائے گئے۔ وہ ان کا نام نہ لیتے اور لارڈ ویول کی نااہلی کی شکایت نہ کرتے تو وہ برصغیر نہ آتے۔ ان کے جانے کے بعد انتقال اقتدار کی تاریخ کی تبدیلی۔ کلکتہ کے متعلق ان کی کانگریس نوازی اور فیروزپور' زیرہ اور فاضلکا کی تحصیلوں کے متعلق ریڈ کلف ایوارڈ کی ترمیم۔ صرف یہی نہیں بلکہ اور بہت کچھ جن میں ان کی اہلیہ کے پنڈت نہرو سے تعلقات بھی شامل تھے ——— ان کے تمام راز افشا کر کے انہیں بے نقاب کر دیا ———

قطع نظر ان تمام امور کے اگر ماؤنٹ بیٹن کے کردار کو ان کے رفقائے کار یا ان کے افسران کی آراء کے تناظر میں دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان کے کردار کی خامیاں صرف اس وجہ سے ظاہر نہیں کی جا رہی تھیں کہ ان کا برطانیہ کے شاہی خاندان سے تعلق تھا۔ بڑوں اور امیروں کی صحبت میں رہ کر سستی شہرت کا حصول ان کا مطمع نظر تھا۔ شاہی خاندانوں سے اپنی عزیز داری کی تشہیر ان کا شیوہ تھا۔ ان کی جرح پذیر خامیوں کا غیر ارادی طور پر تذکرہ کر دینے والے بھی ان کی تضحیک کا ہدف بن جاتے تھے۔ خاص طور پر اس وقت جبکہ وہ حریف سے بدلہ نہیں لے سکتے تھے۔ لارڈ ویول کی تضحیک انہوں نے ویول کی اہلیہ کو اپنی بیگم کی ملازمہ کے برابر قرار دے کر کی تھی۔ وہ خود پسند تھے۔ اور

اپنی ہی ذات کی خیال بندی میں مصروف رہتے تھے۔ ان کی خواہش یہی رہتی تھی کہ انہی کی ذات کو توجہ کا مرکز سمجھا جائے۔ انہوں نے اس کے لئے تعلقات عامہ کے موضوع پر خاص عبور حاصل کیا تھا۔ وہ جہاں بھی جاتے تھے تعلقات عامہ کے ماہران کے ہمراہ ہوتے تھے۔ ان کی کوشش یہی ہوتی تھی کہ عوام ان کے کردار کا وہی پہلو دیکھیں جسے وہ عوام کو دکھانا چاہتے ہیں۔ برطانوی ڈیفنس سٹاف کے چیف جنرل سر جیرالڈ ٹمپلر (Gerald Templer) نے جناب حسان ضیا کے مطابق انہیں ایک بار مخاطب کر کے یہ کہا تھا "ڈکی تم اگر کیل نگل لو تو کارک سکرو باہر نکالو گے" جان کی گن (John Keegan) نے ان کے متعلق کہا تھا کہ "ماؤنٹ بیٹن اپنے آپ کو نامحفوظ محسوس کرتے ہیں اور تنہا ہوتے ہوئے اپنی بیوی سے محبت کے طلبگار ہیں جو انہیں نہیں مل رہی ——" ان کی بیوی تواتر سے بیوفائی کا مظاہرہ کر رہی تھی اور بعض اوقات جی ان کے "دوست" یکے بعد دیگر ان کے ہاں چلے آتے تھے تو ان کے ملازم کو آنے والوں کو ٹالنے میں بڑی دقت پیش آتی تھی۔ وہ اپنی کمیوں کو اپنی شہرت سے پورا کرنے کے حق میں تھے۔ اور شاید اسی جذبہ کے تحت انہوں نے ہندوستان اور پاکستان کا مشترکہ گورنر جنرل بننے کی خواہش ظاہر کی ——

فریڈم ایٹ مڈ نائٹ کے مصنفین کا کہنا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن کو انڈیا کا گورنر جنرل بنانے کا خیال نہرو کے ذہن میں قائداعظم کی اس تجویز سے آیا جو انہوں نے ماؤنٹ بیٹن کے پندرہ اگست کے بعد بھی میانجی اور ثالث کی حیثیت سے برصغیر میں رہ جانے کے لئے پیش کی تھی۔ کتاب کے مصنفین نے یہ نہیں بتایا کہ یہ تجویز قائداعظم نے کس کے سامنے پیش کی تھی۔ اگر انہیں یہ تجویز پیش کرنا ہوتی تو وہ برطانوی حکومت سے براہ راست بات کرتے۔ قائداعظم کی طرف سے یہ تجویز اس وقت پیش کی گئی جب ماؤنٹ بیٹن نے ان سے پاکستان کا گورنر جنرل بھی بننے کے لئے کہا۔ اندازہ یہ ہوتا ہے کہ پنڈت نہرو ماؤنٹ بیٹن کے احسانات کا بدلہ چکانے کے لئے اسے بھارت کے گورنر جنرل کا عہدہ دینے کے لئے تیار تھے۔

چوہدری محمد علی اپنی تصنیف ایمرجنسی آف پاکستان (Emergence of Pakistan) میں کہتے ہیں کہ کانگریس اور ماؤنٹ بیٹن کے مابین فوری انتقال اقتدار کے متعلق ہونے والے مسودے سے ایک ناموقع نتیجہ پیدا ہو رہا تھا۔ ہر کوئی جانتا تھا کہ

تقسیم کا عمل دو اڑھائی مہینوں میں مکمل نہ ہو سکے گا۔ بہت سے حل طلب مسئلے رہ جائیں گے۔ ماؤنٹ بیٹن نے اس اہم مسئلے کے حل کے لئے فیصلہ یہ کیا تھا کہ وہ آزادی کے بعد آٹھ دس مہینوں تک دونوں ریاستوں کا گورنر جنرل بن کے برصغیر میں رہ جائے گا اور تقسیم سے متعلق پیدا ہونے والے عقدے حل کرتا رہے گا۔ یہ تجویز 17 مئی کو پیش کی گئی۔ کانگریس کو یہ تجویز قبول کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آئی۔ پنڈت نہرو اور سردار پٹیل کو یقین تھا کہ ماؤنٹ بیٹن انہی کے بتائے ہوئے کھیل کھیلے گا۔ وہ اس کے احسانوں کا بدلہ بھی چکانا چاہتے تھے اور شاہی خاندان میں اس کے رسوخ سے فوائد بھی حاصل کرنے کے خواہشمند تھے۔ نہرو نے ماؤنٹ بیٹن کی تجویز قبول کرتے ہوئے اسے تحریری اطلاع دے دی کہ کانگریس کو عبوری دور کے لئے دونوں ریاستوں کے لئے مشترکہ گورنر جنرل پر اعتراض نہیں۔ آپ کی نصیحتوں اور آپ کے تجربہ سے استفادہ ہمارے لئے باعث مسرت ہو گا۔ قائداعظم اس وقت ماؤنٹ بیٹن کو ناقابل اعتبار نہیں سمجھتے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ پندرہ اگست کے بعد بھی وہ برطانیہ کے بادشاہ کی نمائندے کی حیثیت سے سوپر گورنر جنرل بن کر برصغیر میں رہ جائیں۔ ان کی یہ بھی خواہش تھی کہ ان کے پاس برطانوی حکومت کی طرف سے ودیعت کردہ ثالثی کے اختیارات بھی ہونے چاہئیں۔ ان کی نگاہ میں دونوں ریاستوں کے درمیان مطلوبات، واجبات اور اثاثوں کی تقسیم کے لئے یہی ایک موزوں طریقہ تھا مگر کانگریس کو یہ طریقہ قابل قبول نہیں تھا۔ فوری انتقال اقتدار سے وہ پاکستان کی اقامت کا موقع فراہم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔ برطانوی حکومت 15 اگست کے بعد برصغیر کے سیاسی معاملات میں کسی قسم کی دخل اندازی مناسب نہیں سمجھتی تھی۔ قائداعظم سوپر گورنر جنرل کے لئے اپنی تجویز کی تائید کرتے رہے۔ مگر کانگریس کا مقصد چونکہ کچھ اور تھا اور یوں معلوم ہوتا ہے کہ برطانوی حکومت بھی اس مقصد کی تکمیل کے لئے کانگریس کی اعانت کر رہی تھی اس لئے دونوں نے قائداعظم کی یہ تجویز قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ برطانوی حکومت کو اس سے پہلے ایک صوبے کو دوسرے سے الگ کرنے اور صوبوں کی تقسیم کا تجربہ تھا۔ انہیں معلوم ہونا چاہئے تھا کہ تقسیم سے متعلق ایسے بہت سے مسئلے جو فوری طور پر حل نہیں کئے جا سکتے باقی رہ جاتے ہیں اور ان کے حل کے لئے تقسیم کے بعد بھی ایک ایسے خود مختار ثالث کی ضرورت رہتی ہے جو ثالثی کر

سکے اور جس کے فیصلوں پر عمل درآمد ہو سکے۔ برطانوی حکومت نے ایک سوپر گورنر جنرل کی تجویز تو نہ مانی البتہ مشترک گورنر جنرل کی تجویز 1947ء میں منظور کر لی قائداعظم کا اعتراض یہ تھا کہ ایک مشترک گورنر جنرل دونوں ریاستوں کے متضاد مشوروں کے سلسلے میں اپنے فرائض انجام نہیں دے سکتا۔ یہ اعتراض درست تھا۔ پاکستان کے گورنر جنرل کے پاس بھارت کے گورنر جنرل کو اور بھارت کے گورنر جنرل کو پاکستان کے گورنر جنرل کو نہ تو کوئی حکم دینے کا اختیار تھا اور نہ ہی ایک کی بات دوسرے سے منوانے کے لئے ایسی کوئی ایالت "مشترک گورنر جنرل ایک کا اعتراض دوسرے تک پہنچانے کا کام ضرور کر سکتا تھا مگر اس اعتراض کو ختم کرانے کے لئے اس کے پاس کوئی اختیار نہ تھا۔ وہ تو دونوں ریاستوں کا آئینی سربراہ تھا۔ فیصلے تو کابینہ کو کرنے تھے اور اگر کابینہ اس کی بات ماننے سے انکار کر دیتی تو خاموشی کے علاوہ اس کے پاس چارۂ کار کوئی نہ تھا۔ قائداعظم کو جو مزاج اور خو کے اعتبار سے آئین اور قانون کے ساتھ زندگی بھر کی رفاقت سے آئینی اور قانونی رجحانات کے مالک تھے مشترک گورنر جنرل کے کردار میں حل طلب مسائل کو سلجھانے کی کوئی صلاحیت دکھائی نہ دیتی تھی۔ وہ مسلم لیگ کے غیر متنازع قائد ہوتے ہوئے بھی مسلم لیگ کی مجلس عاملہ سے اپنے اقدامات کی تائید حاصل کرنے کے قائل تھے۔ اس سے ماؤنٹ بیٹن اور دوسرے بعض اوقات برہم بھی ہو جاتے تھے۔ قائداعظم کا خیال تھا کہ ان دو ریاستوں کے لئے جن کے مفادات متصادم ہوں مشترک گورنر جنرل کا عہدہ محض بیہودگی۔ محض بطلان تھا۔ چودھری محمد علی کا یہ بھی کہنا ہے کہ مشترک گورنر جنرل کی حیثیت کے خلاف آئینی دلیل کے علاوہ اس کا ایک سیاسی پہلو بھی تھا۔ کانگریس یہ پراپیگنڈہ کر رہی تھی کہ پاکستان کا قیام ہندوستان کے کچھ علاقے کی عارضی علیحدگی کے مترادف ہے۔ دونوں ریاستوں کے مشترک گورنر جنرل کے ہونے سے خاص طور پر اس وقت کہ اس کا زیادہ وقت دہلی میں گزرتا اس تاثر کو تقویت ملنے کا احتمال تھا۔ پاکستان کے لوگ بھی اعتراض کر سکتے تھے اور یہ سوال کر سکتے تھے کہ انہیں کس قسم کی آزادی حاصل ہوئی ہے جب بھارت کا گورنر جنرل ہمارا گورنر جنرل بھی ہے اور انگلستان کا بادشاہ آزادی کے بعد بھی ہمارا بادشاہ ہے۔ اور یہ تاثر اور بھی مضبوط ہو سکتا تھا جب تین صوبوں کے انگریز گورنر اور فوج کے انگریز کمانڈر انچیف کو تقرری کا بھی علم تھا۔ ان کے علاوہ پاکستان

کو تجربہ کار بیورو کریٹس کی کمی کے پیش نظر بہت سے انگریز افسروں کو بھی ملازمت کی پیش کش کرنی پڑ رہی تھی۔ پاکستان کو ایک کڑی آزمائش کا سامنا تھا۔ وہ۔ ایک آزاد قوم کی حیثیت سے اپنے مقدر پر اعتقاد ہی انہیں ان مشکلات اور مصائب مستقبل میں انہیں جن کا سامنا کرنا تھا۔ اس کے لئے بھارت اور پاکستان کے درمیان ایک واضح افتراق کی ضرورت تھی۔ ایسا افتراق جس سے رجعت ناپذیر علیحدگی کی نشاندہی ہو ——

جون کا مہینہ ختم ہو رہا تھا۔ قائداعظم نے دونوں ریاستوں کا مشترک گورنر جنرل بننے کی خواہش کو پذیرائی نہیں دی تھی۔ ماؤنٹ بیٹن کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوتا جا رہا تھا۔ وہ تاریخ میں صرف برصغیر کو آزادی عطا کرنے والے پہلے انگریز وائسرائے کی حیثیت ہی سے اپنا نام نہیں لکھوانا چاہتا تھا۔ وہ تاریخ میں دو ریاستوں کے مشترک گورنر جنرل بن کر آزادی کے بعد دونوں کی رہنمائی کرنے والا پہلا مدبر سیاست مدار بن کر بھی زندہ رہنا چاہتے تھے۔ پنڈت نہرو نے اسے خوش آمدید کہہ دیا تھا مگر جناح بڑے پراسرار انداز سے خاموش تھے۔ کیا انہیں یہ معلوم نہیں تھا کہ پاکستان کمزور فریق ہوتے ہوئے ماؤنٹ بیٹن کو ناراض کرنے کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ پاکستان کے سارے اثاثے بھارت کے قبضے میں تھے اور ماؤنٹ بیٹن کی مہربانی ہی پاکستان کو اس کا حصہ دلوا سکتی تھی۔ ایک غیر جانبدار شخص کا اثاثوں کی تقسیم کی کمیٹی کا صدر ہونا پاکستان کے مفاد میں ضرور تھا۔ ماؤنٹ بیٹن تقسیم کے اس پہلو کی جان بوجھ کر تشہیر کر رہے تھے۔ ان کا مقصد یہ تھا کہ بات قائداعظم تک پہنچے گی اور وہ خوفزدہ ہو کر اسے مشترک گورنر جنرل قبول کر لیں گے۔ انہوں نے لارڈ اسے اور ابیل کو دو تین مرتبہ قائداعظم کے پاس بھیجا ——

—— قائداعظم کے انکار پر وہ آپے سے باہر ہو گئے اور انہوں نے ایسی ایسی باتیں کیں جو نہ صرف ان کی کم ظرفی کی بین دلیل ہیں بلکہ ان کے کردار کے اس تاریک پہلو کو بھی اجاگر کرتی ہیں جس کی بنا پر تاریخ انہیں عظمت کا یہ درجہ دینے سے ہمیشہ انکار کرتی رہے گی۔ ان کے متعلق جو بھی لکھا گیا ہے۔ ان کی جس انداز سے تعریف کی گئی ہے اس کے باوجود وہ تاریخ میں کوئی مقام حاصل نہیں کر سکے۔ انہوں نے قائداعظم کو دھمکی دی۔ انہیں باور کرانے کی کوشش کی کہ ان کے انکار سے پاکستان کو بہت نقصان ہو سکتا ہے۔ پاکستان کو اس کے حصے ملنے کا کوئی امکان نہ رہے گا۔ پاکستان کو نقصان ہوا۔

اس کا حصہ اسے نہیں دیا گیا۔ اس کی فوج کا سامان ضبط کر لیا گیا —— پاکستان کی فوج کو جو کچھ ملا اس کی تفصیل کچھ یوں ہے۔

تفصیل	پاکستان کا حصہ	جو پاکستان کو مل سکا یا دیا گیا
آرڈیننس سٹورز (آرڈیننس فوج کا وہ محکمہ ہے جو فوج کو تیل اور اشیائے خوردنی کے علاوہ باقی سب کچھ فراہم کرتا ہے۔ ایک سوئی سے ٹینک تک گولہ بارود کے ساتھ اس محکمہ سے سپلائی کیا جاتا ہے	160000ٹن	23225 ٹن صرف
بکتر بند گاڑیاں بشمول شرمن اور شیورٹ ٹینک	249	نہ ایک بکتر بند گاڑی دی گئی۔ نہ کوئی ٹینک
گولہ بارود ہر قسم	40000 ٹن	ایک چھٹانک بھی پاکستان کے حوالے نہیں کیا گیا۔
انجینیئرنگ کا سامان اور مشینری	173667 ٹن	صرف 1428 ٹن

بعض لوگوں کا خیال ہے کہ پاکستان کو یہ نقصان قائداعظم کے انکار سے ہوا۔ ان کا اندازہ صریحاً غلط ہے۔ وہ لوگ جن کا تعلق فوج کے آرڈیننس کے محکمے سے رہا ہے کہتے ہیں کہ کاغذ پر سٹور تقسیم کرنے کے بعد وہ مال اپنے سامنے ریل کے ڈبوں میں لدواتے تھے۔ مال لدوانے کے بعد ان ڈبوں کو سیل کر دیا جاتا تھا۔ اور انہیں بحفاظت آرڈیننس ڈپو سے نکال کر پاکستان بھجوانے کے لئے ریلوے حکام کے حوالے کیا جاتا تھا۔ مگر ریل کے یہ ڈبے جن میں پاکستان کے لئے سامان لدا ہوا ہوتا تھا کبھی پاکستان تک نہیں پہنچے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہندوستان کی حکومت کے افسران اور اہلکار وہ فوج کے تھے یا سول کے پاکستان کو کوئی چیز دینے کے لئے تیار نہ تھے۔ ماؤنٹ بیٹن دونوں ریاستوں کے مشترکہ گورنر جنرل ہو بھی جاتے جب بھی ان کے احکام کی تعمیل ممکن نہ تھی۔ ان کے پاکستان کے حق میں فیصلے ان کاغذوں تک محدود رہتے جن پر یہ فیصلے کئے گئے تھے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بھارتی کابینہ میں انہیں مخالفت کا سامنا کرنا پڑتا۔ بھارتی کابینہ کے اراکین خاموش بھی رہتے جب بھی ماؤنٹ بیٹن کے حکم کے مطابق ایک کیل بھی پاکستان تک نہ پہنچتا۔

احکام گورنر جنرل کے ہوں یا کابینہ کے۔ ان کی تعمیل ماتحت افسروں اور عملے کا کام ہے اور ماتحت عملہ کبھی کوئی چیز پاکستان کے حوالے کرنے کے لئے تیار نہ ہوتا۔ سوال محض تقسیم کا نہیں تھا۔ سوال تقسیم شدہ مال کو بحفاظت پاکستان تک پہنچانے کا تھا۔ یوں تو مشترکہ ڈیفنس کاؤنسل نے جس کے چیئرمین خود ماؤنٹ بیٹن تھے فوجی ساز و سامان کی تقسیم (64 فیصد بھارت کے لئے اور 36 فیصد پاکستان کے لئے) کی منظوری دے دی تھی۔ اس منظوری کا حشر کیا ہوا۔ کسی نے اس کی طرف توجہ نہیں کی۔

فیلڈ مارشل آکنلک نے جو فوج اور فوجی سامان کی تقسیم کے لئے کام کر رہے تھے حالات سے بیزار ہو کے لکھا تھا۔ (اور ان کی تنقید کا ہدف ماتحت افسران نہیں تھے بلکہ ہندستانی کابینہ تھی) —— مجھے اس امر کی تصدیق کرتے ہوئے کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں ہوتی کہ ہندوستان کی موجودہ کابینہ پاکستان کے مستحکم قیام کو روکنے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہے۔ اس رائے کو میرے سینئر افسران کی متفقہ حمایت حاصل ہے۔ بلکہ تمام برطانوی افسران جو حالات سے آگاہ ہیں میرے ہم خیال ہیں —— کابینہ کے وزراء اور سول کے افسران اور دوسرے لوگ فوج کی تقسیم کے کام میں روڑے اٹکا رہے ہیں۔ ان کا مقصد ہے کہ پاکستان کو فوجی ساز و سامان کا حصہ نہ ملے۔

ماؤنٹ بیٹن ان حالات میں کیا کر سکتا تھا۔ عنان تو پنڈت نہرو کے ہاتھ میں تھی۔ پنڈت نہرو ماؤنٹ بیٹن کو جدھر چاہے موڑ سکتے تھے۔ انہیں سرحد کے گورنر اولف کیرو پسند نہیں آئے۔ انہوں نے ماؤنٹ بیٹن سے کہا۔ انہیں خدشہ تھا کہ اولف سرحد میں استصواب رائے پر اثر پذیر ہو سکتا ہے۔ ماؤنٹ بیٹن نے لندن سے کہا میں اولف کیرو کو پسند کرتا ہوں۔ وہ بہت اچھا منتظم ہے۔ مگر کانگریس اور پنڈت نہرو اس سے ناخوش ہیں اولف کیرو کی چھٹی ہو گئی —— آکنلک نے غلط کام کرنے سے معذرت کی۔ پنڈت نہرو کو ان کا رویہ بھی برا معلوم ہوا۔ پھر ماؤنٹ بیٹن سے کہا گیا ماؤنٹ بیٹن نے وہ محکمہ ہی ختم کر دیا آکنلک جس کے سربراہ تھے۔ حالات سے تو یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ماؤنٹ بیٹن برصغیر کے وائسرائے نہیں تھے۔ وائسرائے درحقیقت پنڈت نہرو تھے۔ ان کی ہر تمنا کا احترام کیا جاتا تھا۔ ان کے لئے بددیانتی سے بھی گریز نہیں کیا جاتا تھا۔ پنڈت نہرو ماؤنٹ بیٹن کی بیوی کے دل پر تو قابض تھے (بعض لوگ کہتے ہیں کہ ان کا جسم بھی پنڈت جی کے

قبضے میں تھا) اس کے ذریعہ ماؤنٹ بیٹن پر حکم چلانا کوئی مشکل بات نہ تھی۔ بنگال کے گورنر بروز (Burrows) اور پنجاب کے گورنر جینکنز (Jenkins) نے آزادی کے بعد گورنر کی حیثیت سے کام کرنے سے معذرت کرلی تھی۔ جینکنز نے تو اسے نامناسب اور وقار کے منافی قرار دے دیا تھا۔ مگر ماؤنٹ بیٹن اس کے لئے پہلے تو قائداعظم کو قائل کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ ناکام ہوئے تو اس قدر برہم ہوئے کہ پاکستان کے مستقبل کے متعلق دھمکیاں دینے لگے۔ ان کی اس تمنا نے خبط کی صورت اختیار کرلی۔

فریڈم ایٹ مڈ نائٹ کے مصنفین کا کہنا ہے کہ قائداعظم اس عہدے کے احتشام اور اس سے منسلک آداب اور رسمی تقاریب سے مرعوب ہو کر اسے اپنے لئے مختص کرنے کے خواہشمند تھے۔ قائداعظم کو جو محبت، جو وقار جو احتشام پاکستان کے عوام نے دیا اس سے بہتر انہیں کسی عہدے سے نہیں مل سکتا تھا۔ انہیں یہ معلوم تھا کہ وہ گورنر جنرل بن کر عوام سے دور ہو جائیں گے مگر حالات کا تقاضا یہ تھا کہ زمام کار انہی کے ہاتھ میں رہتی۔ پاکستان کے پاس تھا کچھ نہیں۔ اس کی زندگی اور اس کے استحکام کے لئے قائداعظم ہی کی ضرورت تھی۔ یہ بجا ہے کہ قیام پاکستان کے بعد وہ ہمیں چھوڑ کے چلے گئے مگر ایک سال کے قلیل عرصے میں حد سے زیادہ وقت طلب مسائل کے باوجود پاکستان استحکام کی راہ پر گامزن ہو چکا تھا۔

یہ کہہ دینا کہ قائداعظم کے انکار سے پاکستان کو نقصان پہنچا دوراز مطلب قرار دیا جا سکتا ہے۔ پاکستان کو نقصان تو ہونا تھا۔ ماؤنٹ بیٹن مشترکہ گورنر جنرل ہو کر اس نقصان کو روک نہیں سکتے تھے۔ اس امکان کا جائزہ بھی لینا چاہئے کہ اگر قائداعظم ان کی بات مان جاتے تو پاکستان کو کیا نقصان ہوتا۔ اس وقت تو ان حالات کا علم نہ تھا اب تو دستاویزی ثبوت اور قابل اعتبار شہادتیں ایسی مل گئی ہیں کہ ماؤنٹ بیٹن ایک طرف تو قائداعظم سے مشترکہ گورنر جنرل کے لئے کہہ رہے تھے دوسری طرف پاکستان کی جڑیں کاٹنے کی فکر میں تھے۔

مستزاد یہ کہ ماؤنٹ بیٹن برصغیر کو متحد رکھنے کا مشن لے کر آئے تھے۔ پاکستان کی تخلیق ان کی مرضی کے خلاف تھی۔ اس امر کی کوئی شہادت نہیں ملتی کہ قائداعظم کے انکار کے بعد ماؤنٹ بیٹن نے ریزرو بینک آف انڈیا کو پاکستان کو اس کے حصے کی رقم کی

ادائیگی کرنے سے منع کر دیا ہو۔ یا فوجی سازو سامان کی پاکستان منتقلی روک دی ہو۔ وہ پاکستان کو ادائیگی کرنے کا حکم دے بھی دیتے تو ریزرو بینک آف انڈیا ان کی بات ماننے سے انکار کر دیتا۔ وہ فوجی سامان گاڑیوں میں لدوا کے بھجوا بھی دیتے تو تمام کی تمام گاڑیاں واہگہ کے اس پار روک لی جاتیں۔

برصغیر کی تقسیم میں دس لاکھ سے زیادہ انسان مارے گئے۔ ستر لاکھ کے قریب مسلمان ہجرت کر کے پاکستان چلے آئے۔ پچاس لاکھ غیر مسلم —— ہندو اور سکھ پاکستان سے نقل مکانی کر کے ہندوستان چلے گئے۔ دنیا کی تاریخ میں آبادی کا تبادلہ کبھی اس انداز سے نہیں ہوا۔ آبادی کا تبادلہ تو خیر ناگزیر تھا۔ مگر ریڈکلف کے ایوارڈ کے اعلان میں تاخیر نے حالات مزید خراب کر دیئے۔ لوگوں کو اس طرح گھروں سے نکالا گیا کہ وہ میزوں پر لگے ہوئے کھانے چھوڑ کر بھاگ نکلے۔ عورتیں اغوا ہو گئیں۔ مرد۔ بچے بوڑھے جوان موت کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ اور ماؤنٹ بیٹن خاموش تماشائی کی حیثیت سے موت کا منظر دیکھتے رہے۔

ڈاکٹر محمد زاہد خاں لودھی کے کہنے کے مطابق راجہ غضنفر علی خاں نے انکشاف کیا کہ تقسیم سے قبل انہیں ماؤنٹ بیٹن نے یہ یقین دلایا تھا کہ اگر کسی فرقے یا کسی ملت نے گڑبڑ شروع کی تو وہ قیام امن کے لئے سخت اقدامات سے بھی گریز نہ کریں گے۔ امن کے لئے وہ چند ہزار کو گولیوں اور بموں سے اڑا دینے کے لئے بھی تیار ہوں گے —— وہ جب کراچی پہنچے اور انہیں ان کا وعدہ یاد دلایا گیا تو انہوں نے بڑی بے پروائی سے بات ٹال دی۔

ماؤنٹ بیٹن کی دروغ گوئی کا ثبوت سیکرٹری آف سٹیٹ فار انڈیا لارڈ لسٹوویل (Lord Listowell) کو گیارہ اگست کو بھیجی جانے والی اس تار سے ہوتا ہے جس میں انہوں نے لسٹوویل کو مطلع کیا تھا کہ انہوں نے ذاتی طور پر باؤنڈری کمشن سے ہر قسم کے رابطے اور مقاربت سے احتراز کیا ہے۔ ان کی شرائط کار کی وضاحتیں بھی نہیں کیں۔ نہ مجھ تک مختلف اطراف سے پہنچنے والے نقطہ ہائے نظر سے انہیں آگاہ کیا ہے۔ ریڈکلف نے بنگال کی تقسیم کا ایوارڈ 12 اگست کو پیش کر دیا ہے۔ اس کے ذریعہ چٹاگانگ کے پہاڑی علاقے کو پاکستان میں شامل کر دیا گیا ہے۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ اس پر کانگریس کی

طرف سے شدید ردعمل کا مظاہرہ ہو گا۔ میں نے ایوارڈ روک لیا ہے —— اور اس کے بعد انہوں نے اصل وجہ بتاتے ہوئے کہا کہ ایوارڈ کے اعلان میں تاخیر سے انگریزوں پر نفرت کا بوجھ کم رہے گا۔ چودہ اگست کو اقتدار پاکستان کے حوالے کر دیا گیا۔ پندرہ اگست کو آدھی رات کے وقت ہندوستان آزاد ہو گیا اور ایوارڈ کا اعلان 17 اگست کو کیا گیا۔ ماؤنٹ بیٹن اگر خون خرابے کی ذمہ داری پاکستان اور ہندوستان کی حکومتوں پر ڈالنا چاہتے تھے تو وہ غلطی پر تھے۔ پاکستان کے نئے حکمران تو ابھی بیٹھنے کے لئے جگہ تلاش کر رہے تھے اور ہندوستان کے حکمران دو دنوں میں انگریز کی غفلت کا خمیازہ بھگتنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتے تھے —— انہوں نے ایک اور تار میں لارڈ لسٹوویل کو بتایا کہ ریڈ کلف نے کہا ہے کہ پنجاب کی تقسیم کا ایوارڈ تیرہ اگست کو پیش کیا جائے مگر مجھے چونکہ کراچی جانا ہے بدیں وجہ میرے پاس اس کے مطالعے کا ابھی وقت نہیں۔ حقیقت یہ تھی کہ یہ ایوارڈ 9 اگست کو پیش کر دیا گیا تھا اور چونکہ اس میں ردوبدل مقصود تھا اس لئے کیمبل جانسن اور جان کرسٹی کے ذریعہ ریڈ کلف سے تاریخ بدلوا لی گئی۔ 9 اگست کو ہونے والی سٹاف کی میٹنگ میں یہ واضح کر دیا گیا تھا کہ پنجاب کے ایوارڈ کا اعلان ریڈ کلف اسی شام کو دے گا مگر وائسرائے نے میٹنگ میں موجود عملے کو یہ ہدایت کی تھی کہ نہ تو وہ ایوارڈ کے مندرجات کی اطلاع کسی کو دیں نہ ہی یہ بتائیں کہ ایوارڈ اسی دن تک مکمل ہو جائے گا۔

بمونٹ نے اپنا بیان 1989ء میں آل سولز کالج کے وارڈن کے پاس جمع کرا دیا۔ اگر ان کے پوتے کو کیمبرج کے ٹرائی پوس (Tripos) کیمبرج میں بی اے کی امتیازی ڈگری) کے لئے برصغیر کی تقسیم کا موضوع نہ ملتا تو غالباً وہ بھی اپنی زندگی کے دوران اس راز کو افشا کرنے کے لئے تیار نہ ہوتے۔ اور یہ راز مستقل طور پر دفن ہو جاتا ماؤنٹ بیٹن کی چار جون کی پریس کانفرنس میں گورداسپور کا حوالہ بے مقصد نہیں تھا۔ اس کے بعد انتقال اقتدار کی تاریخ کا تعین —— پھر کلکتہ کا ہندوستان کے حوالے کیا جانا —— اور پھر زیرہ تحصیل، فیروزپور تحصیل، فاضلکا تحصیل اور فیروزپور ہیڈ ورکس کا ایک جنبش قلم ادھر سے ادھر کر دیا جانا یہ تمام شہادتیں ماؤنٹ بیٹن کی پس پردہ سازباز کی منہ بولتی تصاویر ہیں۔

جونا گڑھ۔ مانا وور۔ منگرول اور حیدر آباد کے مسائل موجود تو تھے مگر اٹھائے گئے چودہ اگست 1947ء کے بعد اس لئے ان کے متعلق کچھ لکھنا مناسب معلوم نہیں ہوتا۔ گورداسپور کی تقسیم کا اعلان تو 17 اگست کو ہوا مگر ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے اپنی پریس کانفرنس میں اس کا ذکر اور جون کے اواخر میں کشمیر کے دورے کے دوران مہاراجہ کشمیر سے ملاقات کی۔ پنڈت نہرو اور مہاتما گاندھی کو خدشہ تھا کہ مہاراجہ کشمیر آزادی اور خود مختاری کا اعلان کر دے گا۔ ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ کشمیر کو تلقین کی کہ وہ خود مختاری کا اعلان نہ کرے اور کسی صورت اپنے لوگوں کی رائے معلوم کرنے کے بعد وہ چودہ اگست سے قبل اپنے ارادوں کی اطلاع ایک یا دوسری دستور ساز اسمبلی کو کر دے۔ ماؤنٹ بیٹن نے مہاراجہ کو یہ بتانے کی تکلیف گوارا نہیں کی کہ اس کی جغرافیائی پوزیشن اور اس کے عوام کی اکثریت کا مسلمان ہونا اس امر کا تقاضا کرتا ہے کہ وہ پاکستان سے الحاق کر لے۔ اور جون میں ہندوستان کے ساتھ الحاق کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا کیونکہ گورداسپور کے متعلق ریڈ کلف کا فیصلہ ابھی محض قیاس آرائی تھی۔ اس وقت ہندوستان اور کشمیر کے درمیان کوئی زمینی رابطہ موجود نہ تھا۔ اور ان حالات میں مہاراجہ کو یہ یقین دہانی کرانا کہ ہندوستان سے الحاق کی صورت میں اسے کسی قسم کی مشکل پیش نہ آئے گی مہاراجہ کو اس الحاق پر اکسانے کے مترادف تھا۔ مزید براں تاریخی حقائق کے سامنے صرف ماؤنٹ بیٹن کا اپنا بیان ہے اور سچائی کے پاس اپنے آپ کو ظاہر کرنے کے بیسیوں طریقے ہیں۔ اس کے چہرے کے کچھ خدوخال بے نقاب ہو گئے ہیں۔ جو باقی رہ گئے ہیں اس کا چہرہ آخر بے نقاب ہو ہی جائے گا۔

مختصر کتابیات

ایمرجنس آف پاکستان Emergence of Pakistan
(چوہدری محمد علی)

انڈیا ونز فریڈم India Wins Freedom
مولانا ابوالکلام آزاد

فریڈم ایٹ مڈ نائٹ Freedom at Mid Night
لیری کولنز اور ڈومینک لاپئر

دی سول سپوکس مین The Sole Spokes Man
عائشہ جلال

قائداعظم محمد علی جناح متھ اینڈ رلیٹی
Quaid-i-Azam Mohammed Ali Jinnah Myth and Relity
وحید الزماں

ماؤنٹ بیٹن اینڈ پارٹیشن Mountbatten and Partition
ایل کے شیروانی

ماؤنٹ بیٹن اینٹی پاکستان رول Mountbatten's Anti-Pakistan Role
ڈاکٹر محمد زاہد خاں لودھی

ریجنل سٹڈیز
روزنامہ ڈان